176
سسپنس
کیسے کیسے سانپ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید

کیسے کیسے سانپ

اشتیاق احمد

حدیث شریف

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبیؐ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح گفت گو فرماتے تھے کہ اگر کوئی الفاظ کو گننا چاہتا تو گن سکتا تھا۔

——— بُخاری شریف ———

یعنی ٹھہر ٹھہر کر الفاظ ادا کرتے تھے۔

ناول پڑھنے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ

- یہ وقت نماز کا تو نہیں ـــــ
- آپ کو سکول کا کوئی کام تو نہیں کرنا ـــــ
- کل آپ کا کوئی ٹسٹ یا امتحان تو نہیں ـــــ
- آپ نے کسی کو وقت تو نہیں دے رکھا ـــــ
- آپ کے ذمے گھر والوں نے کوئی کام تو نہیں لگا رکھا۔

اگر ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ہو تو ناول الماری میں رکھ دیں۔ پہلے نماز اور دوسرے کاموں سے فارغ ہو لیں، پھر ناول پڑھیں۔ شکریہ!

مخلص:

اشتیاق احمد

دو باتیں

السلامُ علیکم

ناول کا نام پڑھ کر آپ اُلجھن میں پڑ گئے ہوں گے۔ ناول کی آخری سطور لکھنے تک یہ نام خود میرے ذہن میں نہیں تھا۔ پھر جب آخری سطر لکھی گئی تو ناول کے لیے یہی نام بالکل فِٹ محسوس ہوا۔ لہٰذا آپ نام کے چکر میں نہ پڑیں اور ناول پڑھنے کا کام کریں۔ جب ناول کے اختتام پر پہنچیں گے تو خود بخود ناول واضح ہو جائے گا۔

اس بار کی کہانی آپ کو پوری طرح گرفت میں تو لے گی ہی۔ بہت لطف بھی دے جائے گی۔ کہانی کے ہیرو

بھی دو حصّے۔ دونوں حصّے ایک دُوسرے سے بڑھ چڑھ کر محسوس ہوں گے۔ یہ تو تھا میرا خیال۔ اپنا خیال آپ خطوط کے ذریعے مجھ تک پہنچائیں گے۔ دیکھنا یہ ہے کہ پہلے دس خط کون سے موصول ہوتے ہیں ——

اشتیاق

یہ ہم ہیں

انسپکٹر جمشید کے فون کی گھنٹی بجی۔ وہ گہری نیند میں تھے۔ اس لیے پانچویں مرتبہ گھنٹی بجنے پر کہیں انھوں نے ریسیور اُٹھایا اور جھلّائی ہوئی آواز میں بولے:

"جی فرمائیے۔"

"ج — جم — شید — جلدی آؤ۔"

انسپکٹر جمشید اُچھل کر کھڑے ہو گئے:

"خیر تو ہے؟" بیگم جمشید نے گھبرا کر پُوچھا۔ فون کی گھنٹی نے انھیں بھی بیدار کر دیا تھا۔

"پپ — پروفیسر داؤد۔" یہ کہتے ہی انھوں نے کمرے سے باہر چھلانگ لگا دی — اتنا وقت نہیں تھا کہ محمود، فاروق اور فرزانہ کو جگا کر ساتھ لیتے۔ بس انھوں نے دو تین چھلانگیں لگائیں، دروازے پر پہنچے اور دُوسرے ہی لمحے ان کی کار اڑی جا رہی تھی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ سڑک

بالکل صاف تھی ۔ ایسے میں وہ طوفانی رفتار سے نہ جاتے
تو کیا کرتے، وہ بھی اس وقت ۔ جب کہ پروفیسر داؤد خطرے
میں تھے ۔ پتا نہیں ، وہاں صورتِ حال کیا تھی ۔ تجربہ گاہ یوں
بھی شہر سے باہر تھی ۔ عام حالات میں یہ سفر آدھ گھنٹے کا
تھا ، لیکن اس وقت انھوں نے صرف سترہ منٹ میں طے
کیا ۔ ابھی وہ تجربہ گاہ سے سو قدم کے فاصلے پر تھے کہ
انھیں سڑک کے عین درمیان میں ایک بہت بڑا پتھر پڑا
نظر آیا ۔ انھوں نے فوری طور پر بریک لگائے ۔ انھیں
فوراً خطرے کا احساس ہوا ۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ کار
کو بریک لگائے ، بلکہ فوراً ہی پچھلا گیر لگا کر گاڑی کو
پوری رفتار سے پیچھے ہٹا لے گئے ۔ اور ان کی یہی پھرتی کام
آ گئی ، کیوں کہ عین اسی وقت گولیوں کی بوچھاڑ اس جگہ
گری تھی ۔ جہاں چند سیکنڈ پہلے انھوں نے کار کو بریک لگائے
تھے ۔ جب تک دوسری باڑھ ماری جاتی ۔ وہ گولیوں کی زد
سے باہر جا چکے تھے ۔ اور پھر انھوں نے دوسرا کام یہ کیا
کہ کار کا دروازہ کھولتے ہوئے نیچے کی طرف چھلانگ لگا
دی اور سڑک سے نیچے لڑھکتے چلے گئے ۔ اور اس وقت
تک لڑھکتے رہے ۔ جب تک کہ ایک تن آور درخت کی
اوٹ نہ لے لی ۔

اب انھوں نے اپنا پستول جیب سے نکال کر ہاتھ
میں لے لیا ۔ ان کی پیشانی پر لکیریں ابھر آئی تھیں ۔ وہ
جلد از جلد تجربہ گاہ میں داخل ہو کر پروفیسر داؤد تک
پہنچ جانا چاہتے تھے ، لیکن دشمنوں نے ان کا راستا روک رکھا
تھا ۔ اور بھی انھوں نے نہ جانے کیا کیا انتظامات کر رکھے
تھے ۔ انھوں نے تھوڑا سا سر نکال کر سامنے دیکھا ۔
دور دور تک کوئی بھی نظر نہیں آ رہا تھا ۔ اس کا مطلب
ہے ، دشمن چھپے ہوئے تھے ۔ کسی ایسی جگہ جہاں سے
انھیں دیکھا نہیں جا سکتا تھا ۔

انھوں نے چند لمحے کے لیے سوچا اور پھر پیچھے ہٹنے لگے ،
یہاں تک کہ کار سے بہت دور ہٹ آئے ۔ اب انھوں نے
جنگل ہی جنگل میں ایک دائرے میں سفر شروع کیا اور
کافی دیر کے بعد تجربہ گاہ کے پچھلے حصّے کی طرف پہنچ گئے ،
لیکن یہ دیکھ کر ان کی سٹی گم ہو گئی کہ اس طرف بھی
مسلّح دشمن موجود تھے اور جگہ جگہ سے ان کی رائفلوں کے
دہانے جھانک رہے تھے ۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ تجربہ گاہ کو چاروں طرف سے
گھیرے میں لیا جا چکا تھا ۔ اور پروفیسر داؤد کو بچانے کے
لیے تجربہ گاہ میں داخل ہونا بہت ضروری تھا ۔ دوسری

طرف ۔ شاید بد معاش یہ تہیہ کر چکے تھے کہ وہ اپنے علاوہ کسی
کو بھی تجربہ گاہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے ۔ اور
اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ یہ لوگ ابھی تک تجربہ گاہ
میں داخل نہیں ہو سکے تھے ۔ غالباً ان کی آمد سے پہلے
ہی تجربہ گاہ کے دروازے بند کر لیے گئے تھے ۔ انھوں
نے اُوپر نظریں اُٹھائیں ۔ کھڑکیاں وغیرہ سب بند نظر آ
رہی تھیں ۔ انھیں اندر داخل ہونے کے لیے بدمعاشوں کے
درمیان سے گزرنا پڑتا ۔ ظاہر ہے ۔ اس صُورت میں ان
سے مُقابلہ ہوتا ۔ کسی نہ کسی طرح اگر وہ تجربہ گاہ کے
دروازے پر پہنچ جاتے تو دروازہ کھلوانا بھی ایک مسئلہ تھا ،
اندر والوں کو کیا معلوم کہ باہر کون ہے ۔

" صرف اور صرف ایک ہی طریقہ ہے ۔ اور وہ یہ کہ ان
سے ٹکرا جاؤں ۔" انسپکٹر جمشید بڑبڑائے ۔ اور پھر انھوں نے
اس فیصلے پر عمل کرنے کا ارادہ کر لیا ۔ ان کے پستول
میں صرف آٹھ گولیاں تھیں ۔ چلتے وقت اتنا ہوش کہاں
تھا کہ اور گولیاں لے سکتے ؛ تاہم انھوں نے اللہ پر بھروسہ
کرتے ہوئے ایک دشمن کی رائفل کی نال کی سیدھ میں گولی
داغ دی ۔

ایک چیخ بلند ہوئی ۔ دُشمن رائفل سمیت اونچی جگہ

سے گرتا نظر آیا اور ساتھ ہی ان سب کی رائفلیں گولیاں
اُگلنے لگیں ۔

رات کا سناٹا گولیوں کی آوازوں سے تار تار ہونے لگا ۔

بیگم جمشید نے دروازہ اندر سے بند کیا اور ان کے
کمرے کی طرف بڑھیں ۔ دستک دیتے ہوئے انھوں نے کہا :

" اُٹھو محمود ، فارُوق ، فرزانہ ۔ تمھارے پروفیسر انکل نے
تمھیں آواز دی ہے ۔"

ان کی مدھم آواز میں نہ جانے کیا تھا کہ وہ یک دم بیدار
ہو گئے ۔ اور ایک ساتھ چلّائے :

" کیا فرمایا آپ نے امّی جان ۔ پروفیسر انکل نے ہمیں
آواز دی ہے ۔"

" ہاں ! کیا تُمھارے کمرے میں رکھے فون کی گھنٹی نہیں
بجی تھی ؟" انھوں نے حیران ہو کر کہا ۔

" پتا نہیں ۔ بجی تھی یا نہیں ۔ ہم شاید آج رات
گھوڑے بیچ کر سوئے تھے ۔" فارُوق نے منہ بنایا ۔

" مَیں نے تمھیں کتنی مرتبہ منع کیا ہے کہ گھوڑے ۔ لیکن

نہیں ۔ یہ وقت ان باتوں کا نہیں ۔ تمھارے ابا جان تجربہ گاہ
کی طرف روانہ ہو چکے ہیں ۔ تم بھی فوراً روانہ ہو جاؤ۔"

"کیا آپ ہمیں کچھ اور نہیں بتا سکتیں؟"

"نہیں ۔ کچھ اور معلوم ہی نہیں ہے۔"

"ایک منٹ امّی جان۔" محمود نے جلدی سے کہا اور پھر
تجربہ گاہ کے نمبر ملائے، لیکن سلسلہ قائم نہ ہو سکا:

"تار کاٹ دیے گئے ہیں ۔ لائن بالکل مُردہ پڑی ہے۔"
اس نے کہا۔

"اوہ! اس کا مطلب ہے ۔ معاملہ بہت سنگین ہے۔" فرزانہ
بڑبڑائی۔

"ابا جان ہم سے بہت پہلے وہاں پہنچ چکے ہوں گے۔
کیوں نہ ہم انکل خان رحمان کو بھی ساتھ لے چلیں۔"

"فون کر دیتے ہیں۔ اگر وہ گھر کے دروازے پر تیار
مل گئے تو انھیں بھی لیتے چلیں گے، ورنہ وہ خود وہاں پہنچ
جائیں گے۔"

محمود نے جلدی جلدی خان رحمان کے نمبر گھمائے۔ اور سلسلہ
ملتے ہی اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا:

"ہیلو انکل ۔ اُمید ہے، آپ خیریت سے ہوں گے؟"

"لیکن رات کے ایک بجے خیریت پوچھنے کی کیا ضرورت

پیش آ گئی؟" اُنھوں نے نیند میں ڈوبی آواز میں کہا۔

"جی بس کیا بتاؤں ۔ پروفیسر انکل۔" محمود نے جلدی جلدی
کہنا چاہا۔

"تو کیا ان کی بھی خیریت پُوچھنے کا ارادہ ہے اس
وقت۔" وہ یک دم بولے۔

"جی نہیں ۔ ان کے ہاں تو خیریت ہے ہی نہیں ۔
ابا جان ان کی طرف روانہ ہو چکے ہیں اور اب ہم جا رہے
ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے۔"

"وُہی جو تمھارا ۔ مَیں دروازے پر تیار ملوں گا ۔
جلد پُہنچو۔" اُنھوں نے گھبرا کر کہا۔

"اپنا پستول ساتھ لے لیجیے گا۔"

"تم فکر نہ کرو۔" اُنھوں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

تینوں کار میں سوار ہوئے اور آندھی اور طوفان کی
طرح وہاں سے روانہ ہو گئے ۔ خان رحمان اپنی کار میں
بالکل تیار بیٹھے تھے ۔ اُنھوں نے اپنی کار وہیں چھوڑ دی
اور ان کی کار میں لد گئے ۔

"معاملہ کیا ہے؟" اُنھوں نے کار پوری رفتار پر چھوڑتے
ہوئے کہا ۔

"ہمارے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم ۔ پروفیسر انکل نے

شاید افراتفری کے عالم میں ابّا جان کو فون کیا۔ اور وہ فون
سنتے ہی روانہ ہو گئے۔ ہمیں امّی جان نے جگا کر یہ اطلاع
دی۔" محمود نے کہا۔

"ہوں! اور تم نے مجھے جگا کر۔" وہ بولے۔

"جی ہاں انکل ۔ کیا کرتے ۔ مجبوری تھی۔" فرزانہ جلدی
سے بولی۔

"اللہ کرے ۔ پروفیسر خیریت سے ہوں۔" خان رحمان بولے۔

"آمین۔" انھوں نے ایک ساتھ کہا۔

اور پھر وہ اس جگہ پہنچ گئے ۔ جہاں سڑک پر بڑا
اور بھاری پتھر موجود تھا ۔ پتھر سے کچھ پہلے ہی انھیں
انسپکٹر جمشید کی کار کھڑی نظر آ گئی تھی ۔ اور پھر اچانک ان کے
کانوں میں گولیوں کی آوازیں گونجنے لگیں :

" ارے باپ رے ۔ یہاں تو گولیاں چل رہی ہیں۔"
خان رحمان بولے ۔

" لیکن انکل ۔ گولیاں اس طرف نہیں ۔ شاید تجربہ گاہ کی
پچھلی سمت میں چل رہی ہیں۔"

" تو پھر ۔ ہم کیوں نہ صدر دروازے کی طرف بڑھنے
کی کوشش کریں ۔ ضرور اس طرف جمشید کا ان سے مقابلہ
ہو رہا ہے۔"

" ہاں! جب وہ یہاں پہنچے ہوں گے ۔ اس پتھر کی وجہ سے
انھیں رکنا پڑ گیا ہو گا ۔ انھوں نے چکر لگا کر تجربہ گاہ کے
عقب میں پہنچنے کا پروگرام بنایا ہو گا ، لیکن دشمن اس طرف
بھی موجود ہو گا ۔ لہٰذا ٹھن گئی ۔ اب اس طرف موجود
دشمنوں کی توجہ بھی پچھلی سمت میں ہو چکی ہو گی ۔ اس لیے ،
شاید ہم صدر دروازے تک پہنچ جائیں۔" محمود نے جلدی جلدی
کہا ۔

"بہت مشکل ہے۔" فرزانہ بڑبڑائی۔

"کیوں ۔ مشکل کیسے؟"

" فرض کر لیتے ہیں ۔ دشمن اب صدر دروازے پر موجود
نہیں ۔ یا ان میں سے چند ایک ہیں ۔ ہم ان کو راستے سے
ہٹا دیتے ہیں ، لیکن ان حالات میں اندر والے تجربہ گاہ کا
دروازہ کیوں کھولنے لگے؟"

" ہم کھلوا لیں گے ۔ تم فکر نہ کرو۔" فاروق مسکرایا۔

" لیکن کیسے؟" فرزانہ نے اسے گھورا ۔

" یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے ۔ بھئی تم ترکیب سوچو
گی اور ہم اس پر عمل کریں گے۔" فاروق نے شوخ آواز میں کہا۔

" اسے کہتے ہیں ۔ میرا جوتا میرا سر۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

" تم کر لو ۔ ہم تو نہیں کہتے۔"

"اب آگے بھی بڑھو گے۔ یا یہیں کھڑے باتیں بگھارتے رہو گے۔" خان رحمان نے جل کر کہا۔

اور وہ صدر دروازے کی طرف بڑھنے لگے، لیکن وہ پوری احتیاط سے کام لے رہے تھے، لیکن درختوں کی اوٹ لے کر اور کبھی رینگ کر۔ آخر وہ صدر دروازے کے نزدیک ہو گئے۔ انھوں نے دیکھا۔ دروازے پر اور دائیں بائیں آٹھ مسلح آدمی کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور رائفلیں تنی ہوئی تھیں۔ گویا گولیاں چلانے کے لیے بالکل تیار تھے۔

"اب ان کا کیا کریں؟" فرزانہ بولی۔

"گولیاں تو پہلے ہی چل رہی ہیں۔ ہم بھی چلا دیتے ہیں۔" خان رحمان نے فوراً کہا۔

"بلا وجہ انھیں جان سے مارنا مناسب نہیں۔ اگر ہم انھیں بے ہوش کر کے کام چلا سکیں تو بہتر رہے گا۔" محمود نے کہا۔

"میں بھی یہی کہنے والا تھا۔"

"جیسے تمھاری مرضی، لیکن ترکیب کیا کریں؟"

"درختوں کی اوٹ لے لیں۔ میں ذرا سی کھڑبڑ کروں گا۔ ان میں سے ایک دو صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے ضرور آئیں گے۔ ہم انھیں ڈھیر کر دیں گے۔ ان کی خبر

لینے دوسرے آئیں گے، لیکن اُلٹا ہم اُن کی خبر لے لیں گے۔" فرزانہ نے سرگوشی کی۔

"بہت خوب۔" خان رحمان مسکرائے۔

انھوں نے ترکیب پر عمل شروع کیا۔ چھپنے کے بعد محمود نے ایک جھاڑی کو قدرے ہلایا۔ آواز ان کے کانوں تک پہنچ گئی۔ پہلے تو چونک کر انھوں نے جھاڑی کی طرف دیکھا۔ پھر ان میں سے دو جھکے جھکے جھاڑی کی طرف بڑھنے لگے۔ اچانک ان دونوں کے سروں پر پستولوں کے دستے اس زور سے لگے کہ وہ دھڑام سے گرے اور بے ہوش ہو گئے۔

"یہ۔ یہ کیسی آواز تھی؟" دروازے پر کھڑے ایک دشمن نے گھبرا کر کہا۔

"بہت پیاری۔" فاروق نے دبی آواز میں کہا۔ خان رحمان مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

"تم ٹھہرو۔ ہم دونوں دیکھتے ہیں۔" ایک نے کہا اور دو اور ان کی طرف بڑھنے لگے۔ نزدیک آنے پر ان کا بھی یہی انجام ہوا۔

"یہ۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔" ایک دشمن نے بوکھلا کر کہا۔

"شاید ان جھاڑیوں میں ہمارے دشمن موجود ہیں۔ فوراً پوزیشن لے لو۔"

باقی چاروں نگران زمین پر لیٹ گئے اور رائفلیں چھپائے

جھاڑی کی طرف رینگنے لگے - اچانک ان کے پیچھے رائفلیں بلند
ہوئیں - اور ان کے کندھے ان کے سروں پر لگے - ان چاروں
نے پہلے چار حملہ آوروں کی رائفلیں قبضے میں کر لی تھیں - گویا ان
کا جوتا انھی کے سر پر دے مارا تھا -

اب وہ اُٹھ کر دروازے پر آئے - دروازہ اندر سے
بند تھا - پچھلی طرف سے ابھی تک گولیوں کی آوازیں آ رہی
تھیں -

محمود نے اپنے مخصوص انداز میں گھنٹی کا بٹن دبایا - چند
سیکنڈ تک خاموشی رہی ، پھر دبی آواز میں پوچھا گیا :

" دوسری طرف کون ہے ؟"

آواز پروفیسر داؤد کی تھی -

" یہ ہم ہیں پروفیسر انکل "

دروازہ فوراً کھل گیا - جوں ہی وہ اندر داخل ہوئے ،
پھر بند ہو گیا -

ہوشیار !

پندرہ منٹ تک فائرنگ جاری رہی ، لیکن ان پندرہ
منٹ میں انھوں نے صرف تین بار فائر کیا تھا - اور تینوں
مرتبہ کامیاب رہے تھے ، دوسری طرف سے اندھا دھند گولیاں
برسائی جاتی رہیں -

اس دوران میں وہ آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہے ،
ان کے خیال میں گولیاں برسانے والے قریباً آٹھ نو آدمی
تھے - جن میں سے تین ڈھیر ہو چکے تھے - ان کی کوشش
یہ تھی کہ کسی طرح گرنے والے ان تین آدمیوں تک پہنچ جائیں
تاکہ ان کی رائفلیں سمیٹ لیں اور جم کر ان پر فائرنگ
کر سکیں ، لیکن سامنے سے آنے والی گولیاں ان کی پیش
نہیں جانے دے رہی تھیں - آگے بڑھنا صرف اسی وقت
آسان ہو سکتا تھا جب ان کے پاس گولیوں کا ذخیرہ ہوتا ،
لیکن ان کے پستول میں اب صرف پانچ گولیاں باقی تھیں -

آخر اُنھوں نے ایک ترکیب سوچی۔ وُہ غیر محسوس طور
پر پیچھے ہٹنے لگے۔ جب کافی پیچھے ہٹ گئے تو دُشمنوں
نے بھی اس بات کو محسوس کر لیا۔ اب وُہ آگے بڑھنے
لگے۔ انسپکٹر جمشید ایک خاص انداز میں پیچھے ہٹتے چلے
گئے۔ ان کا تعاقب کرنے والے صرف چھے تھے۔ ان
چھے کے چھے کے پاس جدید طرز کی طاقت ور رائفلیں تھیں،
ایک بار بھی اگر وُہ ان کی زد میں آ جاتے تو چند سیکنڈ کے
اندر وُہ انھیں چھلنی کر دیتے۔

پیچھے ہٹنے کے دوران وُہ کبھی کبھی جھلکی دکھا دیتے۔ ورنہ
وُہ تعاقب کا خیال چھوڑ سکتے تھے۔ آسمان پر چاند چمک رہا
تھا اور یہ جو کچھ ہو رہا تھا۔ چاند کی روشنی میں ہو رہا
تھا۔ ایک مناسب فاصلہ طے کرنے کے بعد انسپکٹر جمشید ایک
سمت میں دھڑام سے گرے اور لڑھکتے چلے گئے۔ دشمن نے
خیال کیا۔ کہ ان کا پَیر کسی ڈھلوان جگہ پر پڑ گیا جس کی
بنا پر وُہ لڑھک گئے ہیں، لہٰذا اندھا دھند ان کی طرف
دوڑ پڑے۔ ادھر انسپکٹر جمشید پوزیشن لے چکے تھے۔ بس
پھر کیا تھا۔ زد میں آتے ہی وُہ ٹریگر دباتے چلے گئے۔
پانچ آدمی اُوپر تلے گرے۔ ایک رہ گیا۔ ادھر انسپکٹر جمشید
کا پستول خالی ہو چکا تھا۔ اور ایک دُشمن کچھ فاصلے پر

زندہ سلامت موجود تھا۔ جو پوری طرح ان کی زد میں
تھا، لیکن وُہ کیا کرتے۔ گولیاں تو ختم ہو چکی تھیں۔ دشمن
مَوت کا سامنا کرنے کے لیے خود کو تیار کر چکا تھا۔
لیکن جب اس نے دیکھا کہ مخالف سمت سے گولی نہیں
آئی۔ تو یک دم اس نے اپنی رائفل تان دی۔ انسپکٹر
جمشید بجلی کی سی تیزی سے گرے۔ اور ایک درخت کی اوٹ
میں چلے گئے۔ دشمن ان کی طرف دوڑا، اب وُہ شیر ہو چکا
تھا۔ جان گیا تھا کہ مخالف کے پستول میں کوئی گولی نہیں
رہی، لیکن وُہ ایک بات بھول گیا اور وُہ یہ کہ اس کا
مُقابلہ کسی عام فرد سے نہیں ہے۔

جُوں ہی وُہ درخت کے نیچے پہنچا۔ کوئی چیز اس کے
سر پر لگی۔ سر پر لگنے والی چیز خالی پستول تھا۔ جو چاقو
کے انداز میں پھینک کر مارا گیا تھا۔

وُہ اوندھے منہ گرا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے نکل
گئی۔ انسپکٹر جمشید نے رائفل کی طرف چھلانگ لگا دی۔ دُوسرے
ہی لمحے رائفل اُن کے ہاتھ میں تھی۔ اور اس کا کندھا
دُشمن کے سر پر دو بار برس چکا تھا۔ اس کی طرف سے
اطمینان ہو جانے کے بعد وُہ تجربہ گاہ کی طرف دوڑ پڑے،
وُہ جلد از جلد عمارت میں داخل ہو جانا چاہتے تھے۔

صدر دروازے کے سامنے کچھ فاصلے پر اوٹ میں ہو کر انھوں
نے جائزہ لیا۔ دروازے پر کوئی بھی نظر نہ آیا۔ آخر وہ
دروازے پر پہنچ گئے اور گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

★

"یہاں سب خیریت تو ہے انکل۔" محمود نے دروازے
کی طرف مُڑتے ہوئے کہا اور پھر دھک سے رہ گیا، کیوں کہ
انھوں نے تو پروفیسر داؤد کی ہی آواز سُنی تھی۔ اور یہی خیال
کیا تھا کہ دروازہ انھوں نے ہی کھولا ہے، لیکن معاملہ
اس کے بالکل اُلٹ تھا۔ دُوسرے ہی لمحے انھوں نے
ایک کھُردری آواز سُنی:

"ہاتھ اُوپر اُٹھا دو۔ مَیں پروفیسر نہیں ہُوں۔" اس شخص
نے پروفیسر داؤد کی آواز میں کہا۔

"لل۔ لیکن۔ آپ نے ان کی آواز کس طرح چُرا لی۔"
فارُوق کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

"تمھارا جملہ سُن کر خوشی ہوئی۔" اس شخص نے کہا۔

"ہمیں تمھاری خوشی کی نہیں۔ پروفیسر انکل کی خوشی
کی ضرورت ہے۔ یہ بتاؤ۔ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں

ہیں۔"

"ایسی بھی کیا بے چینی۔ ابھی بتا دیتے ہیں۔ چلو اندر۔"
اس آدمی نے کہا۔ اس کے پیچھے دو آدمی عجیب وضع
کی رائفلیں لیے کھڑے تھے۔ اس نے ان کی طرف مُڑتے
ہوئے کہا:

"تم میں سے ایک دروازے پر ہی رہے اور اگر
کوئی اور ان کا ساتھی دروازے پر پہنچ جائے تو مجھے
اطلاع دے دینا۔ میں اس کے "استقبال کے لیے بھی حاضر
ہو جاؤں گا۔"

"شکریہ مسٹر بوچنگ۔" رائفل والا بولا۔

"مسٹر بوچنگ۔ کیا تم چینی ہو؟" محمُود پُوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"ارے نہیں۔ تم غلط سمجھے۔" وُہ ہنسا۔

"تو پھر۔ کیا تم جاپانی ہو؟" فارُوق نے کہا۔

"یہ اندازہ بھی غلط ہے۔"

"نام تو ایسا ہی ہے۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"نام کا کیا ہے۔ نام تو جعلی بھی ہو سکتا ہے۔" اس
نے کہا۔

"ہونے کو تو تم بھی جعلی ہو سکتے ہو۔" فارُوق نے
جل بھُن کر کہا۔

"ہاں! ہو سکتا ہوں - تم کچھ بھی سمجھ لو۔"
"آخر تم چاہتے کیا ہو؟"
"یہ تمہیں پروفیسر داؤد بتائیں گے۔" اس نے سفاک لہجے میں کہا -

وہ ان کے آگے چلتے ہوئے تجربہ گاہ میں داخل ہوئے - اور پھر یہ دیکھ کر دھک سے رہ گئے کہ پروفیسر کرسی سے بندھے ہوئے تھے - مارے تکلیف کے ان کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا - شاید انہیں بہت سختی سے باندھا گیا تھا -

"یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں انکل۔" فرزانہ نے لرزتی آواز میں کہا -

"کوئی بات نہیں - بہادروں کی زندگیوں میں ایسے بھی دو چار مقام آتے ہیں - مجھے تو حیرت ہے کہ تم لوگ بھی آ پہنچے -"

"شکر ہے - آپ کو صرف حیرت ہے - افسوس نہیں۔" محمود بولا -

افسوس کس بات کا - ابھی تک بازی ہمارے ہاتھ میں ہے -"

"جی کیا فرمایا - بازی - کیسی بازی؟" محمود جلدی سے بولا -

"یہ لوگ کسی کی تلاش میں آئے ہیں، لیکن جس کی تلاش میں آئے ہیں - وہ یہاں نہیں ہے۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"یہ غلط ہے - وہ یہاں کے علاوہ کہیں بھی نہیں ہے۔" بوچنگ بولا -

"تو پھر تلاش کر لو - ساری تجربہ گاہ تمہارے سامنے پڑی ہے - بلکہ ساری عمارت۔" پروفیسر داؤد بولے -

"تلاشی کا کام جاری ہے - بہت جلد میرے ساتھی مسٹر چین غوف کو لے کر آتے ہوں گے۔"

"چچ - چین غوف - یہ - یہ کس چیز کا نام ہے۔" فاروق گھبرا گیا -

"چیز کا نہیں - ایک انسان کا۔" پروفیسر بولے -

"لیکن آپ کا کسی مسٹر چین غوف سے کیا واسطہ؟"

"یہ لوگ زبردستی واسطہ جوڑنے کی کوشش میں ہیں۔"

"ہم سمجھے نہیں انکل - یہ کیا چاہتے ہیں۔"

"میں بتاتا ہوں - مسٹر چین غوف ونٹاس کے سب سے بڑے سائنس دان ہیں - اور -"

"اوہ!" ان کے منہ سے بے ساختہ نکلا -

"ہاں! ونٹاس کے سب سے بڑے سائنس دان - وہ ان کے ملک سے فرار ہو گئے ہیں۔"

"کیا فرمایا۔ پروفیسر انکل۔ فرار ہو گئے ہیں"۔

"ہاں! یہ لوگ ونٹاس کے سُراغ رساں ہیں۔ ہمارے مُلک میں ہی کہیں رہتے ہیں۔ ان کی حکومت نے انھیں اطلاع دی ہو گی کہ مسٹر چین غوف یہاں سے فرار ہو گئے ہیں اور ہمارے مُلک میں داخل ہوئے ہیں۔ لہٰذا انھیں تلاش کر کے ونٹاس پہنچایا جائے۔ ساتھ میں ونٹاس کی حکومت نے انھیں یہ بھی کہا ہو گا کہ پروفیسر چین غوف کو میرے ہاں تلاش کیا جائے"۔ پروفیسر داؤد جلدی جلدی بولے۔

"سوال یہ ہے کہ آپ کے ہاں ہی کیوں؟"

"ان کی حکومت کا یہ خیال بھی ہے کہ چین غوف اگر کہیں جا سکتے ہیں تو میرے ہاں"۔ پروفیسر مسکرائے۔

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

"اور ہماری حکومت کا خیال غلط ہرگز نہیں ہے۔ پروفیسر صرف اور صرف یہاں آئے ہیں"۔

"ساری عمارت اس وقت تمھارے قبضے میں ہے۔ تلاش کر لو"۔ پروفیسر بولے۔

"پروفیسر داؤد۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمھارے لہجے میں بہت پختگی ٹپک رہی ہے۔ اور ایسی پختگی جھوٹ

بولنے والے کے لہجے میں ہرگز نہیں ہوتی۔ لیکن ہم کیا کریں۔ ہماری حکومت کو بھی سو فی صد یقین ہے کہ پروفیسر چین غوف اگر کہیں ہے تو تمھاری تجربہ گاہ میں"۔ بوچنگ نے اُلجھے ہوئے انداز میں کہا۔

"اس کا مطلب ہے۔ تمھیں بھی یقین ہے کہ چین غوف یہاں نہیں ہے۔ لیکن اپنی حکومت کی ہدایات پر عمل کرنے پر تم مجبور ہو"۔ فاروق نے مُسکرا کر کہا۔

"ہاں!" اس نے ڈھیلے ڈھالے لہجے میں کہا۔

"سوال یہ ہے کہ پروفیسر چین غوف تمھارے مُلک سے فرار کیوں ہوا؟" فرزانہ نے بے چینی کے عالم میں پُوچھا۔

"اس کے ذہن پر اسلام کا بھوت سوار ہو گیا"۔ بوچنگ نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"کیا کہا۔ اسلام کا بھوت"۔ محمود کے منہ سے نکلا۔

"ہاں! کیا تم اس بھوت سے واقف نہیں ہو"۔ بوچنگ کا لہجہ ناخوش گوار تھا۔

"شاید ابھی تک ملاقات نہیں ہوئی"۔ فاروق نے انکار میں سر ہلایا۔

"مطلب یہ کہ اسے اسلام سے دل چسپی پیدا ہو گئی ہے، لیکن ہمارے مُلک میں حکومتی سطح کے آدمی اسلام کے

پاس بھی نہیں پھٹک سکتے، پھر بھلا حکومت یہ کس طرح
برداشت کر لیتی کہ ملک کا سب سے بڑا سائنس دان
اسلام کے خیالات کو اپنے دماغ میں جگہ دے دے۔
لہٰذا اس کی چھان بین شروع کر دی گئی۔ چین غوف
اس چھان بین سے پریشان ہو گیا۔ اور ایک دن وہاں
سے بھاگ نکلا۔"

"ہوں! اب یہ بھی بتا دو کہ تمھاری حکومت کا یہ
خیال کیوں ہے کہ چین غوف فرار ہونے کے بعد اگر کہیں
ہو سکتا ہے تو۔ یہاں۔"

"ان کا یہ خیال اس لیے ہے کہ مسٹر چین غوف پروفیسر داؤد
سے بہت متاثر ہے۔ اس نے کئی سائنس کانفرنسوں میں
ان کا ذکر بہت اچھے الفاظ میں کیا ہے، لیکن اس چیز
کو ہماری حکومت نے نوٹ کر لیا اور اس کی نگرانی اور
خفیہ چھان بین شروع کر دی گئی۔ خفیہ چھان کے نتیجے
میں بہت سی کام کی باتیں معلوم ہوئیں۔ معلوم ہوا کہ
چین غوف اور پروفیسر داؤد کے درمیان خط و کتابت ہوتی
رہی ہے۔" لوچنگ یہاں تک کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"کیوں انکل۔ کیا یہ سچ ہے؟"

"یہ ان کا کہنا ہے، لیکن ابھی تک یہ لوگ یہاں سے

مسٹر چین غوف کا ایک خط بھی تلاش نہیں کر سکے۔"

"خط پڑھنے کے بعد آپ جلا دیتے ہوں گے، کیوں کہ
آپ یہ کس طرح پسند کر سکتے ہیں کہ آپ دونوں کے
تعلقات کے بارے میں کسی کو معلوم ہو۔" لوچنگ بولا۔

"تم کچھ بھی سوچ سکتے ہو۔ میں تمھاری سوچ پر پہرے
تو بٹھا نہیں سکتا۔" پروفیسر داؤد نے بھنّا کر کہا۔

"انکل تجربہ گاہ کے عملے کے باقی لوگ نظر نہیں آ رہے؟"

"رات کے وقت کام کرنے والے سب لوگوں کو انھوں نے
ایک کمرے میں باندھ کر ڈال دیا ہے۔" انھوں نے جل
کر کہا۔

"اور۔ شائستہ۔"

"اسے بھی ایک اور کمرے میں بند کیا گیا ہے۔"

"آخر یہ لوگ تجربہ گاہ میں کس طرح داخل ہو گئے،
دروازے پر تو باقاعدہ نگران موجود ہوتے ہیں۔"

"اس بات پر ہم سب کو حیرت ہے۔ نہ جانے انھوں
نے نگرانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ بہر حال جب یہ تجربہ گاہ
میں داخل ہو رہے تھے۔ اس وقت میں نے افراتفری
کے عالم میں تم لوگوں کے نمبر ملائے اور صرف ایک لفظ
کہہ سکا تھا کہ ریسیور چھین لیا گیا۔"

"لیکن وہ ایک لفظ ہمارے یہاں آنے کا سبب بن گیا۔" محمود مسکرا دیا۔

"لیکن جمشید۔ تم لوگوں کے ساتھ نظر نہیں آ رہا۔"

"وہ ہم سے پہلے یہاں پہنچ چکے تھے۔اور باہر موجود دشمنوں سے ٹکرا گئے تھے۔اسی وجہ سے تو ہم اندر آنے کے قابل ہوئے، لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ لوگ پہلے ہی اندر پہنچ چکے ہیں۔" محمود نے افسوس زدہ لہجے میں کہا۔

"یہ ان کی رائفلیں ہماری سمجھ میں نہیں آئیں۔" فاروق بولا۔

"جدید قسم کی ہیں۔ان میں سے بے ہوش کر دینے والا دھواں نکلتا ہے۔ اور ان پر اثر انداز نہیں ہوتا، انھوں نے اس دھوئیں کا توڑ پہلے ہی کر رکھا ہے۔" پروفیسر بولے۔

"خیر۔ ہمارا ان کا جھگڑا ہی کیا۔ یہ لوگ اپنے پروفیسر چین غوف کو تلاش کر لیں اور لے جائیں۔" فرزانہ نے منہ بنایا۔

"اب ہم یہ نہیں کر سکتے۔" پروفیسر داؤد نے فوراً کہا۔

"جی کیا مطلب۔ ہم کیا نہیں کر سکتے۔"

"پروفیسر چین غوف اگر یہاں آئے ہوئے ہوتے اور ہمیں یہ کہ دیتے کہ وہ اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہیں تو ہم

اپنی جانوں پر کھیل کر بھی انھیں ان لوگوں سے بچاتے، لیکن اس صورت میں ہم کیا کر سکتے ہیں۔ جب کہ وہ یہاں آئے ہی نہیں۔"

"ہوں! یہ بھی آپ ٹھیک کہتے ہیں۔"

اسی وقت قدموں کی آواز سنائی دی۔اور پھر چھ سات آدمی وہاں آ موجود ہوئے:

"مسٹر چین غوف پوری عمارت میں نہیں ہیں۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"یہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ارے ہاں۔ میں سمجھ گیا۔" بوچنگ نے چونک کر کہا، پھر جلدی سے بولا:

"میں بھی کتنا بے وقوف ہوں۔"

"آپ کو ہی پتا ہو گا جناب۔" فاروق بولا۔

"کیا مطلب۔کس چیز کا پتا ہو گا۔" بوچنگ بھنّا اٹھا۔

"اس بات کا کہ آپ بھی کتنے بے وقوف ہیں۔"

"بکو مت۔ ورنہ زبان گدی سے کھینچ لی جائے گی۔" وہ غرّایا۔

"مشکل ہے جناب۔" محمود نے حسرت زدہ لہجے میں کہا۔

"کیا مشکل ہے؟" وہ دھاڑا۔

"یہ کہ اس کی زبان گدی سے کھینچ لی جائے۔"

"یہ کیا مشکل ہے۔"

"اس کی زبان ذرا بین الاقوامی قسم کی ہے۔ اب تک نہ جانے کتنی بڑی بڑی طاقتیں اسے کھینچنے کی کوشش کر چکی ہیں۔"

"ہاں! یہ تو ہے۔" فارُوق نے دانت نکال دیے۔ اس کے انداز پر پروفیسر داؤد کو بھی ہنسی آ گئی۔

"آپ کو کیا بات سوجھی ہے جناب؟" آنے والوں میں سے ایک نے منہ بنا کر پُوچھا۔ شاید اسے ان کی باتیں زہر لگی تھیں۔

"ان لوگوں نے مسٹر چین غوف کو ضرور کہیں اور چھپایا ہوا ہے۔ اور اسی لیے پروفیسر داؤد کے لہجے میں پختگی ٹپک رہی تھی، لیکن اب یہ پختگی غائب ہو جائے گی۔"

"خام خیالی ہے تمھاری۔" پروفیسر داؤد مسکرائے۔

"ردفو۔ اب دُوسرا قدم اٹھانا ہو گا۔ میرا تھیلا کہاں ہے؟"

"بیرونی دروازے کے ساتھ ایک کونے میں رکھ دیا تھا سر۔ کہ اُٹھائے اُٹھائے کیا پھرنا۔ جب ضرورت ہو گی۔ اُٹھا لیں گے۔"

"تو پھر۔ اب اس کی ضرورت ہے۔"

"میں ابھی لاتا ہوں سر۔" ردفو نے کہا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا چلا گیا۔ وُہ بوچنگ کے تمام ساتھیوں میں لمبا تھا۔ تیز طرار بھی نظر آتا تھا۔ تین منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی، اس کے ہاتھ میں مگر مچھ کی کھال کا بنا ہوا ایک تھیلا تھا۔ تھیلا فرش پر رکھ کر اس نے کھول ڈالا۔ اور بولا:

"کیا چیز نکالوں سر؟"

"پہلے نمبر پر پنچ مشین کافی رہے گی۔ اسے پروفیسر داؤد کے سر پر کس دو۔ اور پہلا بٹن دبا دو۔ ذرا دیکھیں تو سہی۔ پروفیسر داؤد میں کس حد تک قوتِ برداشت ہے۔" بوچنگ بولا۔

"کیا مطلب۔ اے مسٹر بوچنگ۔ تم کیا کرنا چاہتے ہو؟" محمود چلّا اُٹھا۔

"پروفیسر داؤد سے یہ اگلوائیں گے کہ مسٹر چین غوف کہاں ہیں؟"

"خبردار۔ تم ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کر سکتے، ہم یہاں مَوجُود ہوں اور کوئی ان کے ساتھ زیادتی کر جائے۔ کیسے ممکن ہے۔" محمود نے چلّا کر کہا۔

"اوہو۔ یہ دم خم۔ بونانٹ۔ اپنی رائفل کا ٹریگر

دبا دو۔"

"او کے سر۔" ایک چھوٹے قد والا ساتھی فوراً بولا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کر سکتے۔ اس نے ٹریگر دبا دیا۔ ساتھ ہی محمود، فاروق اور فرزانہ نے ایک ساتھ اس پر چھلانگیں لگائی تھیں۔

"اوہو۔ اس قدر پھرتی۔" بوچنگ حیرت زدہ رہ گیا۔

تینوں بوناٹ سے بُری طرح ٹکرائے۔ بوناٹ چاروں شانے چت گرا، لیکن اس وقت تک کمرے میں دھواں پھیل چکا تھا۔ انھیں اپنے ہاتھ پیر جواب دیتے محسوس ہوئے۔ بے ہوشی کا حملہ بہت شدید تھا، لیکن بے ہوش ہونے سے پہلے انھوں نے دروازے کی گھنٹی بجنے کی آواز سنی۔ فوری طور پر انھیں خیال آیا۔ گھنٹی بجانے والے ضرور ان کے والد ہوں گے۔

اور ساتھ ہی وہ مکمل طور پر بے ہوش ہو گئے۔

پروفیسر داؤد بھی ان کے ساتھ ہی بے ہوش ہوتے تھے۔

خان رحمان نے بھی بوناٹ پر چھلانگ لگانے کی تیاری کی تھی، لیکن محمود، فاروق اور فرزانہ ان سے زیادہ تیزی دکھا گئے تھے۔ اس لیے ان کی چھلانگ درمیان میں ہی رہ گئی تھی۔ ہاں بے ہوش ہونے میں

وہ بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے تھے۔

ادھر بوچنگ نے اپنے ساتھیوں سے کہا:

"ہوشیار۔ گھنٹی بجانے والا انسپکٹر جمشید بھی ہو سکتا ہے۔"

باہر لے آؤ

"یہ ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے سر۔" روفو نے گھبرا کر کہا۔
"کیوں ۔ ہو کیوں نہیں سکتا۔"

"اس کے مقابلے پر ہمارے نو ساتھی موجود ہیں اور ان کے درمیان فائرنگ ہو رہی ہے۔"

"بھئی ۔ وہ انسپکٹر جمشید ہے ۔ خیر ۔ اندر آ کر اس کی دال بھی نہیں گلے گی ۔ سنو ۔ میں نے سوچا ہے ۔ ان لوگوں کو کوئی مہلت دینا ہمارے حق میں زہر ہو سکتا ہے ۔ لہٰذا کوئی موقع نہیں دیا جائے گا ۔ ہمارا ایک ساتھی دروازے پر پہلے ہی موجود ہے ، ایک آدمی اور لے جاؤ ۔ تم میں سے دو دائیں اور بائیں کھڑے ہو جائیں، اور ایک دروازہ کھولے ۔ دروازہ کھلتے ہی ٹریگر ضرور دب جائیں ۔ تاکہ وہ فوراً بے ہوش ہو جائے ۔ اور ہم اطمینان سے اپنا کام کر سکیں۔"

"او کے سر ۔ ایسا ہی ہو گا۔" روفو نے کہا اور اپنے ایک ساتھی کو لے کر نیچے چلا گیا۔

بیرونی دروازے پر پہنچ کر اس نے ایک آدمی کو دائیں طرف اور دوسرے کو بائیں طرف کھڑا کیا ۔ اور خود آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا ۔ ایک ساتھ دونوں رائفلوں کے ٹریگر دب گئے ، لیکن ان کی حیرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا جب انھوں نے دیکھا کہ دروازے پر کوئی بھی نہیں ہے:

"ارے ۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے ، پھر گھنٹی کس نے بجائی تھی۔"

"کم از کم گھنٹی بجانے والا ہمارا ساتھی نہیں ہو سکتا ۔ ورنہ دروازے پر ہی موجود ہوتا۔"

"تت ۔ تو پھر۔" ان کے منہ سے نکلا۔

"ٹھہریے ۔ میں باہر نکل کر دیکھتا ہوں۔"

وہ رائفل چھتیائے ہوئے باہر نکلا ، لیکن پھر اچھل کر اندر آ گرا ۔ ساتھ ہی انسپکٹر جمشید نے ان پر چھلانگ لگائی ۔ دونوں کو ساتھ لیتے ہوئے فرش پر ڈھیر ہو گئے ۔ انھیں سنبھلنے کا ذرا بھی موقع نہ ملا ۔ آن کی آن میں لمبے لیٹے نظر آئے ۔ ان کے سروں پر ایک ایک مزید ٹھوکر رسید کرنے کے بعد وہ دروازہ اندر سے بند کرتے ہی

اوپر کی طرف لپکے۔ انھوں نے دروازہ دھکیلا اور بے دھڑک اندر داخل ہو گئے۔

لیکن فوراً ہی انھیں زور دار چکر آیا۔ اور وُہ گرتے چلے گئے۔

"یہیں تم سے غلطی ہو گئی انسپکٹر جمشید۔ میں پہلے ہی اندازہ لگا چکا تھا کہ تم گھنٹی بجانے کے بعد دروازہ کھلنے پر ضرور کوئی چال چلو گے، لیکن ساتھ ہی تم یہ اُمید بھی رکھو گے کہ اندر والے اپنے ساتھیوں کے انتظار میں کوئی حرکت نہیں کریں گے، لیکن مجھے اپنے ساتھیوں پر ذرا اعتماد نہیں تھا۔ لہٰذا میں پہلے ہی تیار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تم اب بے ہوش ہو رہے ہو۔ تم اگر ایک آدھ منٹ تک سانس روک بھی لو تو کیا ہے، مَیں نے پورا دُھواں خارج کروایا ہے۔ دُھوئیں کی یہ مقدار کم از کم تین منٹ تک رہے گی اور مَیں جانتا ہُوں۔ یا یہ کہہ لو کہ مجھے بتایا گیا ہے کہ تم تین منٹ تک اپنا سانس نہیں روک سکتے۔ شاید ڈیڑھ یا پونے دو منٹ تک ایسا کر سکو۔ وُہ بھی اس وقت۔ جب تم پہلے سے تیار ہو، لیکن چُوں کہ کمرے میں داخل ہوتے وقت تم ذہنی طور پر اس صورتِ حال کے لیے تیار نہیں تھے۔

اس لیے۔ دُھوئیں کی کچھ مقدار تو تم اپنے جسم میں پہنچا بھی چکے۔"

وُہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ انسپکٹر جمشید اپنا دماغ اندھیروں میں ڈوبتا محسوس کر رہے تھے اور پھر وُہ بے ہوش ہو گئے، بوچنگ نے خوش ہو کر کہا:

"اس سے پہلے کہ یہ لوگ ہوش میں آئیں۔ انھیں باندھ لو۔ پھر ہم نہایت اطمینان سے اپنا کام کریں گے۔"

"لیکن مسٹر بوچنگ۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ آتے وقت اپنے محکمے کے دُوسرے لوگوں کو بھی خبردار کر کے آئے ہوں۔" ایک بولا۔

"یہ ہو تو نہیں سکتا، کیوں کہ ان کی عادت یہ نہیں ہے؛ تاہم اگر کوئی اور آیا تو ہم اسے بھی دیکھ لیں گے، یُوں بھی ہم رات ختم ہونے سے پہلے پہلے اپنا کام کر چکے ہوں گے۔ جہاں تک میرا خیال ہے۔ پروفیسر چین غوث کو کہیں اور رکھا گیا ہے۔ اور یہی ہمیں معلوم کرنا ہے۔"

"لیکن پہلے تو ان کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنا پڑے گا۔"

"انتظار زیادہ لمبا نہیں ہوگا۔ ہمارے پاس ہوش میں لانے والی دَوا جو مَوجُود ہے۔"

ان سب کو باندھا گیا، پھر کوئی دوا سنگھائی گئی — چند منٹ بعد ہی انھوں نے آنکھیں کھول دیں —

"ہائیں — ابا جان — یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں۔" محمود نے انھیں بندھا پا کر کہا۔

"بس بھئی — ہو گئی مجھ سے بھی چوک۔"

"تو کیا آپ کو انھوں نے دروازے پر ہی بے ہوش کر دیا تھا؟" فرزانہ بولی۔

"نہیں — نیچے دروازے پر آنے والے تین سے تو میں ٹکرا گیا تھا — لیکن اوپر کمرے میں داخل ہوتے وقت میں اس خیال میں رہا کہ یہاں موجود لوگ بے خبر ہوں گے، لیکن یہ شخص زیادہ ہی چالاک ہے — اس نے پہلے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اس کے ساتھیوں کو لمبا لٹا دوں گا — لہٰذا یہ ہوشیار تھا — اس لیے میں یہاں آ کر مار کھا گیا —

"چلیے خیر — کوئی بات نہیں — اب تو کھا چکے ہم مار۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"بات کیوں نہیں — ابھی تو بات شروع ہو رہی ہے۔"

"دوستو! اب ہم اپنا کام شروع کرتے ہیں — روفو اور بوناٹ تیسرے کے ساتھ دروازے پر بے ہوش ہوں گے۔

پہلے انھیں ہوش میں لایا جائے گا، کیوں کہ اس تھیلے میں موجود چیزوں کے استعمال سے میرے علاوہ روفو ہی واقف ہے۔ جاؤ — انھیں اٹھا کر لے آؤ۔"

جلد ہی — ان تینوں کو وہاں لے آیا گیا — انھیں ہوش میں لانے کے لیے دوا سنگھانے کی ضرورت نہیں تھی، کیوں کہ رائفلوں کے دھوئیں سے تو وہ بے ہوش ہو نہیں سکتے تھے — لہٰذا انھیں ہلایا جلایا گیا — پھر منہ پر چھینٹے مارے گئے، لیکن ان کے جسم میں کوئی حرکت محسوس نہ ہوئی —

"انسپکٹر جمشید — تم نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟" بوچنگ نے بھنّا کر کہا۔

"بس — ایک ایک ٹھوکر رسید کر دی تھی۔"

"یہ کتنی دیر تک ہوش میں آئیں گے؟"

"میری ٹھوکر کا وقت نصف گھنٹا ہے۔" وہ مسکرائے۔

"لیکن ہم آدھ گھنٹے تک انتظار نہیں کر سکتے۔"

"تب پھر — ہم کیا کر سکتے ہیں۔" محمود نے کہا۔

"ہوں ٹھیک ہے — آلات میں خود استعمال کروں گا۔" اس نے غرّا کر کہا۔

"تم کیا کرنا چاہتے ہو مسٹر؟" انسپکٹر جمشید بولے، کیوں کہ انھیں کچھ معلوم نہیں تھا —

"اوہ ہاں ۔ تمھیں تو کچھ بتایا ہی نہیں۔" بوچنگ بولا ۔ اور پھر اس نے تفصیل دہرا دی اور بولا :

"اب مسٹر جمشید ۔ اگر تم چاہتے ہو کہ پروفیسر داؤد تکلیف اٹھانے سے بچ جائیں۔ تو مسٹر چین غوف کے بارے میں بتا دو۔"

"میں تو خیر کچھ جانتا ہی نہیں ۔ ہاں ۔ میں پروفیسر صاحب سے بات کرتا ہوں۔" انھوں نے کہا اور پروفیسر داؤد کی طرف مڑے :

"پروفیسر صاحب ۔ اگر آپ کو پروفیسر چین غوف کے بارے میں کچھ معلوم ہے تو انھیں بتا دیں ۔ میں مسٹر چین غوف کو ان سے چھڑا لوں گا ۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"پہلی بات تو یہ جمشید کہ مجھے بالکل معلوم نہیں ، وہ کہاں ہیں ۔ اور اگر معلوم ہوتا ۔ تو تمھارے کہنے کے باوجود نہ بتاتا ، کیوں کہ میں سن چکا ہوں ۔ وہ اسلام کی طرف جھک چکے ہیں اور غالباً اس غرض سے بھاگنے پر مجبور ہوئے ہیں، کیا ہم ایک نومسلم ۔ یا ہونے والے مسلمان کو دشمنوں کے حوالے کر سکتے ہیں جمشید ۔ اس سے پہلے ہم خود ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔"

"اوہ ۔ مجھے یہ بات نہیں بتائی گئی تھی ۔ اس صورت میں

تو ہم واقعی پروفیسر چین غوف کو ان کے حوالے نہیں کر سکتے" تھے۔"

"بس تو پھر ۔ اس بحث کو چھوڑو ۔ میں انھیں بتا چکا ہوں کہ پروفیسر کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

"لیکن ہم اس بات کو سچ جاننے پر ہرگز تیار نہیں ہیں۔"

"خوشی سے نہ مانو سچ۔"

"ادھر دیکھیے ۔ یہ رہی پنچ مشین ۔ اب یہ میں آپ کے سر پر کستا ہوں ۔ اور کسنے کے بعد مجھے صرف ایک بٹن بانا ہوگا ۔ اس کے بعد آپ اس طرح فرفر بولیں گے ر کیا کوئی بولتا ہوگا۔" بوچنگ نے فخریہ انداز میں کہا۔

"غلط فہمی ہے تمھاری۔" پروفیسر نے منہ بنایا۔

انھوں نے دیکھا ۔ بوچنگ نے ایک پیالہ نما مشین تھیلے ں سے نکالی اور ٹوپی کی طرح پروفیسر داؤد کے سر پر ے رکھ دیا ۔ پھر اس کے تسمے پروفیسر داؤد کی ٹھوڑی پر ندھ دیے ۔

"یہ دوہری دیوار کا آلہ ہے ۔ اس کی دیواروں کے اندر کچھ ئعات بھرے ہوئے ہیں ۔ اس پیالے کے اندر ایک چھوٹی ی موٹر لگی ہوئی ہے ۔ جب میں بٹن دباؤں گا تو وہ موٹر ومنے لگے گی ۔ اس کے گھومنے سے مائعات گردش میں آ

جائیں گے۔ مائعات کے گردش میں آتے ہی پیالہ آگ کی
مانند گرم ہونے لگے گا اور آپ کو یوں محسوس ہوگا جیسے
آپ کا سر۔ سر نہیں۔ کوئی ہانڈی ہے، جسے گیس کے
چولہے پر رکھ دیا گیا ہے۔ یہ پیالہ ہمارے ہاں غیر ملکی جاسوسوں
کی زبانیں کھلوانے کے لیے بہت ہی کارآمد ثابت ہو چکا
ہے۔ بڑے سے بڑا مجرم بھی اس کے مقابلے میں خاموش
نہیں رہا۔ آج تک میں نے اس پیالے کو ناکام ہوتے نہیں
دیکھا۔ اب میں بٹن دبا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر بوچنگ نے بٹن کی
طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

"ایک منٹ مسٹر بوچنگ۔" انسپکٹر جمشید عجیب سے انداز
میں بولے۔

"کیوں انسپکٹر صاحب۔ گھبرا گئے۔ ابھی تو میں نے بٹن
دبایا بھی نہیں۔"

"میں گھبرایا نہیں۔ اور میرے گھبرانے نہ گھبرانے سے کیا
فرق پڑتا ہے۔ جب کہ پروفیسر صاحب بھی نہیں گھبرائے ہوئے۔"
انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"تب پھر۔ کیا بات ہے؟"

"مجھے پروفیسر صاحب سے علیحدگی میں بات کر لینے دیں۔
شاید کوئی بہتر صورت نکل آئے۔"

"انسپکٹر جمشید۔ تم کوئی چال چلنے کا پروگرام تو نہیں بنا
رہے ہو۔"

"ان حالات میں کیا چال چلوں گا کہ ہاتھ پیر بری طرح
بندھے ہوئے ہیں۔"

"ہوں ٹھیک ہے۔ ہم تم دونوں کو اسی حالت میں ایک
کمرے میں چند منٹ کی مہلت دے دیتے ہیں۔"

"بہت بہت شکریہ۔ اپنا یہ آلہ اتار لیں۔" انھوں نے کہا۔

"ہاں! یہ ٹھیک رہے گا۔"

تھوڑی دیر بعد دونوں ایک کمرے کے فرش پر پڑے
تھے۔ اور کمرے کا دروازہ بند کر دیا گیا تھا:

"تم کیا کہنا چاہتے ہو جمشید۔ مجھے واقعی پروفیسر چین غوف
کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔"

"اب مجھے یقین آ گیا۔ اگرچہ ایک حد تک پہلے ہی
یقین آ چکا تھا۔ چلیے۔ ایک بات تو طے ہے۔ یہ لوگ ہم
سے پروفیسر کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کر سکیں گے۔"

"ہاں! مجھے خوشی ہے اس بات کی۔" وہ بولے۔

"لیکن میں چاہتا ہوں۔ ہم میں سے کسی پر کوئی ظلم
بھی نہ ہو۔ ہماری آنکھوں کے سامنے اگر زیادتی ہوئی۔ تو
یہ بات بھی تو ہمارے لیے ناقابلِ برداشت ہوگی۔"

"لیکن — ہم کر ہی کیا سکیں گے۔"

"میں کچھ سوچ کر ہی الگ کمرے میں آیا ہوں۔"

"کیا سوچ کر۔ جمشید۔" پروفیسر داؤد پُر جوش انداز میں بولے۔

"بس — ابھی یہ نہ پوچھیں۔ ویسے پروفیسر صاحب — اس موقعے پر اگر ہم ایک چھوٹا سا جھوٹ بول دیں۔ تو؟"

"جھوٹ اور ہم — یہ تم کیا کہہ رہے ہو جمشید۔" ان کے لہجے میں حیرت تھی۔

"اس طرح ہم ظلم و ستم سے بچ جائیں گے۔"

"لیکن جھوٹ جیسا بڑا گناہ ہمارے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا۔"

"جی نہیں — ایسے موقعے پر آدمی جھوٹ بول لے تو یہ گناہ نہیں ہوگا — یہ میرا خیال ہے — میں کوئی فتویٰ نہیں دے رہا۔" وہ مسکرائے۔

"نہیں جمشید — یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔"

"شکریہ پروفیسر صاحب — ہوگا تو یہ مجھ سے بھی نہیں میں تو یہ دیکھ رہا تھا کہ آپ کس حد تک پختہ ہیں۔"

"چلو — پھر — دیکھ چکے نا۔" پروفیسر بولے۔

"ہاں! بالکل — اس وقت تجربہ گاہ میں کُل کتنے آدمی بند ہیں؟"

"کُل نو — میرا رات کا عملہ نو ہی آدمیوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے دو میرے اسسٹنٹ ہیں — باقی دوسرے عہدے دار ہیں۔"

"یہ لوگ ہمارے بعد ان پر بھی ظلم توڑیں گے۔" انسپکٹر جمشید نے خیال ظاہر کیا۔

"کیا تم اکرام کو فون کر کے نہیں آئے تھے جمشید؟" پروفیسر داؤد نے پوچھا۔

"اس وقت اتنا وقت ہی کہاں تھا؟" انھوں نے کہا۔

"ہاں! یہ تو خیر ہے — خیر اللہ مالک ہے۔"

"میری ایک تجویز ہے۔" انسپکٹر جمشید نے کچھ سوچ کر کہا —

"کہو — میں سُن رہا ہوں۔"

"تجویز یہ ہے کہ جوں ہی پیالہ گرم ہونے لگے — آپ چلّا اُٹھیں کہ ٹھہرو — میں پتا بتاتا ہوں۔" انسپکٹر جمشید نے سرگوشی کی —

"لیکن ان کے ٹھہرنے پر میں کیا بتاؤں گا؟" پروفیسر داؤد بولے —

"بس آپ میرے وائٹ ہاؤس کا پتا بتا دیں۔" انھوں نے مسکرا کر کہا۔

"اوہ — اچھا — میرا خیال ہے — ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں — اس میں کوئی جھوٹ بولنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔"

"بالکل۔" وہ مسکرائے۔

"تو پھر یہ طے رہا۔" پروفیسر داؤد نے کہا۔

اور پھر دونوں خاموش ہو گئے — انھیں خود مجرموں کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ ضروری گفت گو کر چکے ہیں — اب انھیں کمرے سے نکال لیا جائے — کیوں کہ وہ جتنا بھی وقت مجرموں کا ضائع کر سکتے تھے، بہتر تھا —

آخر دروازے پر ٹھک ٹھک ہوئی — ساتھ ہی بوچنگ کی آواز گونجی:

"آخر یہ گفت گو کب ختم ہو گی؟"

"ہماری گفت گو تو کب کی ختم ہو چکی ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"تب پھر — آواز کیوں نہیں دی؟"

"ہم نے سوچا — آپ لوگوں کو کیوں پریشان کریں۔" انھوں نے کہا —

"یہ کیا بات ہوئی۔" اس نے بھنّا کر کہا اور اندر آ گیا۔

چند لمحے تک گھورتا رہا، پھر بولا:

"ضرور کوئی سازش تیار کی ہے آپ لوگوں نے۔"

"آپ ہماری سازش کے جال میں پھنستے ہی کیوں ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"چلو بھئی — انھیں اسی کمرے میں لے آؤ۔" بوچنگ نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

انھیں پہلے کمرے میں لایا گیا —

"ہاں! کیا فیصلہ کیا؟"

"یہ کہ ہم کچھ نہیں بتائیں گے۔"

"کک — کیا مطلب — کیا آپ کو معلوم ہے — پروفیسر چین غوف کہاں ہیں۔"

"نن — نہیں۔" وہ ہکلائے۔

"بہت خوب — اس کا مطلب ہے — آپ کو معلوم ہے۔" بوچنگ نے خوش ہو کر کہا۔

"نہیں — بالکل نہیں۔" پروفیسر داؤد نے سخت لہجے میں کہا —

"ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔"

اب پھر اس نے وہ پیالہ ان کے سر پر رکھ دیا —

"میں بٹن دبانے لگا ہوں۔"

"پروفیسر صاحب — ہمت مت ہاریے گا۔" انسپکٹر جمشید جلدی سے بولے —

محمود، فاروق، فرزانہ اور خان رحمان نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا — ان کی آنکھوں میں اُلجھن تیر گئی — اسی وقت بوچنگ نے بٹن دبا دیا —

بٹن دبا ہوا ہے

بٹن دبنے کے فوراً بعد تو پروفیسر داؤد کو کچھ بھی محسوس نہ ہوا، لیکن پانچ سیکنڈ بعد ہی پیالہ تیزی سے گرم ہوتا محسوس ہوا — وہ پروگرام کے مطابق بلند آواز میں چلّا اُٹھے:

"ارے یہ تو سچ مچ گرم ہو رہا ہے — اُف — بلا کا گرم۔"

"ہمت — ہمت کیجیے پروفیسر صاحب۔" انسپکٹر جمشید بلند آواز میں بولے —

"ہم — مت — اُف۔" وہ نڈھال آواز میں بولے، پھر زور سے چلّائے:

"نہیں نہیں — ٹھہرو — میں بتاتا ہوں — اسے بند کرو۔"

"بند نہیں کیا جائے گا — اسی حالت میں بتائیں۔"

"وائٹ ہاؤس ۱۰۹ فین روڈ۔"

"بہت خوب — یہ ہوئی نا بات۔"

بوچنگ نے کہا اور آگے بڑھ کر بٹن آف کر دیا — پیالہ

اُتار لیا گیا۔ پروفیسر داؤد دل ہی دل میں مسکرائے۔ ابھی پیالہ بہت معمولی سا گرم ہوا تھا۔

"اب ہم آپ کی بات کی تصدیق کریں گے۔ اگر پروفیسر چین غوف اس عمارت میں ہوئے تو ہمیں آپ سے کوئی غرض نہیں ہو گی۔ ہم انھیں اپنے ساتھ لے کر رخصت ہو جائیں گے۔ اور اگر یہ بات غلط ہوئی تو پھر ہم اس پیالے کو آپ کے سر پر رکھ دیں گے۔"

"ارے باپ رے۔" پروفیسر داؤد نے گھبرا کر کہا۔

اسی وقت روفو ہوش میں آ گیا۔ اس نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا، پھر بولا:

"کیوں سر۔ کیا رہا۔ معلوم ہو گیا پروفیسر چین غوف کے بارے میں۔"

"اُمید تو ہے۔ اچھا ہوا تم ہوش میں آ گئے۔ تمھیں ابھی اور اسی وقت ایک مہم پر روانہ ہونا ہے۔ لو۔ بوناٹ بھی ہوش میں آ گیا۔ اس کو بھی ساتھ لے جاؤ۔"

"جانا کہاں ہے سر؟"

"وائٹ ہاؤس، ۱۰۹ فین روڈ۔"

"بہت بہتر۔ تو پروفیسر کو انھوں نے وہاں رکھا ہوا ہے۔"

"ہاں! اگر وہاں کوئی نگران وغیرہ ہوں تو انھیں ٹھکانے

لگا دینا اور پروفیسر کو نکال کر ادھر لے آنا۔"

"بہت بہتر!"

"فین روڈ کا تمھیں پتا ہی ہے۔"

"جی ہاں! بالکل۔ آپ فکر نہ کریں۔ ہم ایک گھنٹے تک آ جائیں گے۔"

"رابو اور چومنگ کو بھی ساتھ لے جاؤ۔" بوچنگ نے کہا۔

وہ چاروں وہاں سے رُخصت ہوئے۔

"اب ہمارے پاس سوائے انتظار کے اور کوئی کام نہیں، اس دوران ہم ذرا باہر موجود اپنے ساتھیوں کی خبر لے لیں۔ ان میں سے کوئی زندہ بھی ہے یا نہیں۔ کیوں انسپکٹر، کیا وہ سب کام آ گئے؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔ زخمی ہوئے بغیر تو کوئی رہا نہیں۔" انھوں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے۔ یہ سودا ہمیں بہت مہنگا پڑا ہے۔"

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اور وہ کیا؟"

"اگر پروفیسر چین غوف نے مسلمان ہونے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اور اب وہ تم لوگوں کے مُلک میں نہیں رہنا چاہتا تو اس میں آپ کا کیا نقصان ہے۔"

"اس سے بڑا کیا نقصان ہوگا کہ مُلک کا سب سے بڑا
سائنس دان ہمارے مُلک کے کام آنے کی بجاے اب
دشمن مُلک کے کام آئے گا۔ دُوسرے یہ کہ اس کے مُسلمان
ہونے کی خبر ساری دُنیا پڑھے گی تو ہماری عزت کیا خاک میں
نہیں مل جائے گی۔"

"تو کیا اس طرح انھیں واپس لے جا کر تم لوگ انھیں
ان کے ارادے سے باز رکھ سکو گے؟"

"باز بے شک نہ رکھ سکیں۔ قید میں تو ڈال سکیں گے،
یا پھر غدّاری کے جُرم میں مَوت کی سزا تو دے سکتے ہیں۔"

"ہُوں۔" انھوں نے کہا اور سوچ میں گم ہو گئے۔

پھر ایک گھنٹا گزر گیا۔ بو چنگ نے پریشان ہو کر
گھڑی کی طرف دیکھا، پھر بولا:

"وُہ لوگ نہیں آئے۔ اس کا مطلب ہے۔ وُہ وہاں
پھنس گئے ہیں۔ پروفیسر صاحب۔ کیا اس عمارت کے گرد
زبردست پہرہ تھا؟"

"نہیں۔" انھوں نے کہا۔

"تھوڑے بہت نگران تو ہوں گے ہی؟"

"ہاں۔" انھوں نے کہا۔

"پھر بھی میرے ساتھیوں کو آجانا چاہیے تھا۔" اس

نے فکر مندانہ انداز میں کہا۔

"کچھ دیر اور انتظار کر لیں۔"

"اور پھر۔ اس کے بعد؟" اس نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"اس کے بعد۔ اس کے بعد جو جی میں آئے کریں۔"

پندرہ منٹ اور گزر گئے۔ اب تو بو چنگ کا رنگ اڑ
گیا۔ اس نے کہا:

"نہیں۔ نہیں۔ ان لوگوں نے ضرور کوئی چال چلی ہے،
اب میں ان کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کروں گا۔ اب
پھر پیالہ پروفیسر داؤد کے سر پر رکھا جائے گا۔"

"لیکن میں تو اس وقت سے تمھارے سامنے موجود ہوں،
مجھے کیا معلوم۔ وائٹ ہاؤس میں کیا ہوا ہے۔ اگر وہاں
تمھارے ساتھیوں کو کچھ نہ ملا ہوتا تو وُہ فوراً واپس نہ
آجاتے۔ ضرور کوئی بات ہے۔ تم پہلے ان کی خبر لو۔
میرے سر پر پیالہ بعد میں رکھنا۔"

"نہیں۔ ہم بہت وقت ضائع کر چکے ہیں۔ ایسا نہ ہو
کہ دن نکل آئے اور ہم پروفیسر چین غوث تک نہ پہنچ
سکیں۔ اگر ایسا ہوا تو بہت سبکی ہو گی۔ باس تو اڑا دے
گا ہمارے چیتھڑے۔"

"تو ابھی۔ تم لوگوں کا کوئی باس بھی ہے۔"

"ہاں! اس ملک میں جتنے بھی وشاس کے جاسوس موجود ہیں۔ ان کا ایک عدد لیڈر بھی ہے۔ ہم سب اس کے احکامات پر عمل کرتے ہیں۔ اور اسے براہِ راست وشاس سے احکامات ملتے ہیں۔"

"اور۔ آپ کے باس کا نام کیا ہے مسٹر بوچنگ؟"

"پتا نہیں۔ کسی کو نہیں معلوم۔ ہمیں خفیہ انداز میں احکامات ملتے ہیں۔ کبھی فون پر تو کبھی بذریعہ ڈاک۔ لیکن باس آج تک ہمارے سامنے نہیں آیا۔"

"ہم تو آپ کو ہی باس سمجھ رہے تھے۔" فاروق بولا۔

"نہیں۔ میں باس نہیں۔ باس تو بڑی چیز ہے۔ ویسے اس مہم کے احکامات ہمیں انھی سے ملے ہیں۔"

"اور کیا بذریعہ فون ملے تھے؟"

"ہاں! بذریعہ فون۔ گویا باس کو معلوم ہے کہ ہم اس وقت یہاں ہیں۔ بلکہ اس وقت تک تو ہمیں فارغ ہو کر انھیں اطلاع دے دینی چاہیے تھی۔"

"اور تم انھیں اطلاع کس طرح دیتے؟"

"وہ اس وقت ہمیں خود فون کرتے۔ بلکہ وہ فون پر رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہوں گے، لیکن ہم تو اپنے ٹھکانے پر ہیں ہی نہیں۔ تو جواب کیا دیں گے۔

لٰہذا اب وہ کچھ دیر انتظار کر کے پھر فون کریں گے۔"

"بہتر ہو گا۔ آپ جا کر انھیں اطلاع دے دیں کہ کام نہیں ہو سکا۔" انسپکٹر جمشید نے مشورہ دیا۔

"شکریہ! ہم اتنی آسانی سے نہیں جائیں گے۔"

"تو پھر جتنی آسانی سے جائیں گے، بتا دیں۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"کیوں نہ ہم میں سے دو وائٹ ہاؤس تک ہو آئیں۔" بوچنگ کا ایک ساتھی بولا۔

"نہیں۔ پہلے ہی چار ساتھی وہاں پھنسوا بیٹھا ہوں۔"

"تب پھر؟" اس کے ساتھی نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"اب ہمیں اسی ترکیب پر عمل کرنا ہو گا۔ قیدیوں والا کمرہ کھول دو۔ اور انھیں بھی اٹھا کر یہیں لے آؤ۔ جاؤ جلدی کرو۔" اس نے قدرے تیز آواز میں کہا۔

اس کے سارے ساتھی اس کمرے کی طرف مڑ گئے۔ جس میں قیدی رکھے گئے تھے۔

جلد ہی تجربہ گاہ کے عملے کے افراد وہاں لائے گئے۔

"تم میں سے کون بتائے گا کہ وشاس کے سائنس دان پروفیسر چین غوف کہاں ہیں۔ جس نے بتانے میں پہل کی اسے انعام دیا جائے گا۔ باقیوں کو سزا دی جائے گی۔

سزا بھی ایسی کہ تم لوگوں کی رُوحیں تک لرز اُٹھیں گے۔"

" وناس کے سائنس دان پروفیسر چین غوف ۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب ۔ وہ یہاں کہاں ۔ وُہ تو اپنے مُلک کے سب سے بڑے سائنس دان ہیں ۔ وناس کا صدر بھی ان سے عزت اور احترام سے پیش آتا ہے۔" ان میں سے ایک نے حیران ہو کر کہا۔

" ہاں ! یہ ٹھیک ہے ؛ لیکن اب وُہ وناس میں نہیں ہے، وہاں سے فرار ہو کر اس مُلک میں داخل ہو چکا ہے ۔ اور اس مُلک میں اگر وُہ کہیں آ سکتا تھا تو یہاں۔"

" افسوس ۔ وُہ ادھر تو نہیں آئے پھر۔" ایک اور نے کہا۔

" یُوں کام نہیں چلے گا ۔ تم لوگوں میں سے پروفیسر صاحب کے اسسٹنٹ کون کون سے ہیں ؟

" ہم دو ۔ باقی عملہ ہم دو کے ہی ماتحت ہے۔" ایک نے آگے بڑھ کر کہا۔

" اور تم دونوں کے نام کیا ہیں ؟

" میرا نام خالد فارُوق ہے ۔ اور یہ جالب رشید ہے۔"

" اس کا مطلب ہے ۔ اگر پروفیسر چین غوف یہاں آئے ہیں تو آپ دونوں کو ضرور معلوم ہوگا۔"

" نہیں ! بہت سی باتیں پروفیسر صاحب ہمیں بھی نہیں بتاتے۔"

جالب رشید نے فوراً کہا۔

" لیکن پورے ایک آدمی کا کسی عمارت میں بالکل خفیہ طور پر رہنا نا ممکن ہے"۔ بوچنگ بولا۔

" پتا نہیں ۔ رہنا ممکن ہے یا نہیں ۔ ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔" خالد فارُوق بولا۔

" خیر ۔ ہم تم پر اپنا ایک آلہ استعمال کرنا چاہتے ہیں ۔ تم دونوں کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔"

" کک ۔ کیسا آلہ ؟ جالب رشید نے بوکھلا کر کہا۔

" سر پر اوڑھنے کا ایک آلہ ۔ جب اس کا ایک بٹن دبایا جاتا ہے تو پھر انسان سچ بولنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔"

" آخر کیسے ۔ بٹن دبانے سے ہوتا کیا ہے ؟ جالب رشید نے بے چین ہو کر پُوچھا۔

" آلہ فوری طور پر گرم ہو جاتا ہے ۔ اور سر ہانڈی کی طرح پکنے لگتا ہے۔"

" یا اللہ رحم۔" خالد فارُوق نے گھبرا کر کہا۔

" ابھی سے گھبرا گئے ۔ ابھی تو آلہ رکھا بھی نہیں گیا ۔ ہاں تو پروفیسر چین غوف کے بارے میں بتا رہے ہو یا نہیں۔"

" پتا ہی نہیں تو بتائیں کیا ۔ ویسے اگر پتا ہوتا تو کبھی نہ بتاتے۔"

"ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔" یہ کہہ کر بوچنگ نے اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا ۔ اس نے وہ پیالہ اٹھایا اور خالد فاروق کے سر پر رکھ دیا:

"ایک بات نوٹ کر لو ۔ مسٹر۔ پتا نہیں تمہارا کیا نام ہے۔" خالد فاروق کی آواز میں گونج تھی۔

"میں بوچنگ ہوں ۔ تم لوگوں کے لیے ننگی تلوار۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔

"شکریہ مسٹر ننگی تلوار ۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ایک بات نوٹ کر لو اور وہ یہ کہ میری روح تن سے جدا ہو سکتی ہے ۔ تم میرے منہ سے کوئی لفظ نہیں اگلوا سکتے، یہ اور بات ہے کہ اس معاملے میں مجھے کچھ بھی معلوم نہیں۔" خالد فاروق نے جذباتی انداز میں کہا۔

"ابھی پتا چل جاتا ہے۔" بوچنگ مسکرایا، پھر خود آگے بڑھا اور بٹن دبا دیا۔

خالد فاروق چند لمحے تو مسکراتا رہا تھا، پھر اس کے چہرے کا رنگ تبدیل ہونے لگا اور آخر وہ چلا اٹھا:

"اف مالک!"

"کیوں نکلنے لگی جان۔" بوچنگ ہنسا۔

"ہاں! نکلنے لگی جان ۔ لیکن مجھے کچھ معلوم نہیں ہے،

معلوم ہوتا تو بھی نہ بتاتا۔"

"ابھی صرف چند سیکنڈ ہوئے ہیں ۔ نصف منٹ پورا ہونے کے بعد معاملہ تمہاری برداشت کی حد سے نکل جائے گا۔" اس نے کہا۔

"اس اطلاع کے لیے شکریہ!"

اور پھر خالد فاروق کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخیں نکلنے لگیں، پھر اچانک اس کی گردن ڈھلک گئی۔ بوچنگ نے آگے بڑھ کر بٹن آف کر دیا اور بولا:

"مجھے یقین آگیا ۔ اسے واقعی کچھ نہیں معلوم۔ اگر معلوم ہوتا تو ضرور بتا دیتا ۔ اور اب باری ہے اس شخص کی۔" اس نے جالب رشید کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں! کیوں نہیں۔" جالب رشید نے جذبات سے عاری انداز میں کہا۔

"مسٹر بوچنگ ۔ تمہیں اس ظلم کا حساب دینا ہوگا۔" انسپکٹر جمشید نے منہ بنا کر کہا۔

"جب تم حساب لینے کے قابل ہو جاؤ تو بتا دینا۔"

"فکر نہ کرو ۔ وہ وقت جلد آنے والا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے منہ بنایا۔

"شاید ۔ تم یہ سوچ رہے ہو انسپکٹر ۔ کہ مدد بہت جلد

آنے والی ہے۔ تو یہ آپ کی خوش فہمی ہے ، کوئی مدد نہیں
آئے گی۔" بوچنگ نے فخریہ انداز میں کہا۔
" یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو؟" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔
" ہم نے پہلے ہی ان باتوں کا انتظام کر رکھا ہے۔"
" لیکن تم ایک بات نہیں جانتے مسٹر بوچنگ۔" انسپکٹر جمشید
عجیب سے لہجے میں بولے۔
" اور وہ کیا؟"
" یہ کہ ۔ ہم صرف اور صرف اللہ کی مدد پر بھروسہ رکھتے
ہیں ۔ اور اللہ کی مدد کو تم ہم تک آنے سے نہیں روک سکو
گے۔"
" خیر بھئی ۔ دیکھیں گے تمہارے اللہ کی مدد کس طرح
پہنچتی ہے۔"
" تمہارے ساتھی وائٹ ہاؤس سے واپس کیوں نہیں آ
سکے ۔ اگر اس پر غور کر لو ۔ تو بھی اس نتیجے پر پہنچ جاؤ
گے کہ ہمیں اللہ کی مدد پہنچ رہی ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔
" اپنے ان ساتھیوں کے بارے میں میں اُلجھن ضرور محسوس
کر رہا ہوں ، لیکن اس حد تک فکر مند نہیں کہ یہاں کام چھوڑ
کر اس عمارت کا رُخ کر بیٹھوں ۔ نہیں ، میں اپنا کام
یہاں جاری رکھوں گا ۔ لہٰذا اب باری ہے ۔ دوسرے

اسسٹنٹ کی۔"
" لاؤ ۔ میں اپنے ہاتھوں سے یہ پیالہ اپنے سر پر رکھ
لوں۔" جالب رشید بولا۔
" بھئی واہ ۔ پروفیسر صاحب کے یہ اسسٹنٹ تو کچھ زیادہ
ہی جری ہے۔"
" یہاں کا ہر شخص اللہ نے چاہا تو جری ثابت ہوگا۔"
محمود نے منہ بنا کر کہا۔
" لیکن جری ثابت ہونے کے باوجود کر کچھ نہیں سکو
گے ، کیوں کہ اوّل تو ہم نے تم لوگوں کو باندھ رکھا ہے ،
دُوسرے یہ کہ جب چاہیں گیس فائر کر کے اور بے بس کر
سکتے ہیں۔"
وُہ منہ بنا کر رہ گئے ۔ بوچنگ کا ایک ساتھی پیالہ اتار چکا
تھا ۔ جُوں ہی وُہ پیالہ لے کر جالب رشید کی طرف بڑھا ،
اس نے اکڑ کر کہا :
" میں کہتا ہوں ۔ میرے ہاتھ کھول دو ۔ یہ پیالہ میں
اپنے ہاتھ سے اپنے سر پر رکھوں گا ۔ تاکہ تم جان تو سکو ،
ہم کس قدر جرأت والے ہیں۔"
" ٹھہرو بھئی ۔ اس شخص کی جرأت بھی دیکھ ہی لیں ۔
کھول دو اس کے ہاتھ ۔ اب اگر اس نے اپنے ہاتھوں

سے پیالہ اپنے سر سے اُتار پھینکا تو اس میں جرأت نام
کی کوئی چیز نہیں ہو گی اور اس کا جرأت مند ہونے کا
دعویٰ ایک دیوانے کی بڑ ہو گی۔ ورنہ میں خود اسے جرأت مند
مان لوں گا۔" بوچنگ نے جلدی جلدی کہا۔

اس کا ساتھی پیالہ ایک طرف رکھ کر ہاتھ کھولنے
لگا۔ اب دل چسپی اور سنسنی پہلے کی نسبت کئی گنا بڑھ گئی،
ہر کوئی جالب رشید کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تو تمہارا کیا خیال ہے مسٹر بوچنگ۔ جوں ہی پیالہ
گرم ہو گا۔ یہ پیالے کو اُتار پھینکے گا؟" انسپکٹر جمشید نے عجیب
سے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں! بالکل۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کسی شخص کے
ہاتھ آزاد ہوں اور وہ اس پیالے کو اپنے سر پر رہنے
دے۔"

"خیر بھئی۔ دیکھتے ہیں۔" وہ بولے۔

جالب رشید کے ہاتھ کھل گئے۔ بوچنگ کے ساتھی نے
پیالہ اس کے ہاتھوں میں دے دیا۔

"لگ۔ کہیں یہ پیالے کو توڑ نہ دے سر؟" بوچنگ کا
ایک اور ساتھی گھبرا کر بولا۔

"نہیں۔ پیالہ ٹوٹنے والا نہیں ہے۔" اس نے جواب

دیا۔ نظریں جالب رشید پر جمی رہیں۔

جالب رشید نے پیالہ دونوں ہاتھوں میں تھاما اور پھر
اسے سر کی طرف لے گیا۔ اس طرح جیسے اپنے سر پر
اپنے ہاتھوں سے دستارِ فضیلت رکھ رہا ہو۔

پیالہ سر پر رکھنے کے بعد اس نے اس کا تسمہ بھی
ٹھوڑی پر کس دیا۔ اور بولا:

"اب تم بٹن دبا سکتے ہو۔"

"بٹن بھی خود دبا لو۔" بوچنگ بولا۔

"بہت بہتر۔ کون سا بٹن ہے۔ یہ۔" اس نے ہاتھوں
سے ٹٹول کر پوچھا۔

"ہاں! اسے نیچے کی طرف دبانا ہے۔" اس نے کہا۔

"بہت اچھا۔" جالب رشید نے کہا اور بٹن دبا دیا۔ اب
سب ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے دل
زور زور سے دھڑک رہے تھے، کیوں کہ اس وقت ایک امتحان
شروع ہو چکا تھا۔

چند سیکنڈ تک جالب رشید بالکل پُرسکون بیٹھا رہا۔
پھر اس کا چہرہ سُرخ ہونا شروع ہوا۔ اس نے اپنے
ہونٹ دانتوں تلے دبا لیے۔

"لیجیے۔ انسپکٹر جمشید۔ اس کا کام ہونے لگا ہے۔

بس چند سیکنڈ کی اور بات ہے۔" بوچنگ کی آواز اُبھری۔

کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ جالب رشید کا منہ سُرخ ہوتا چلا گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی اُنگلیوں کو ایک دُوسرے میں پھنسا لیا تھا۔ اور انھیں مضبوطی سے بھینچ رکھا تھا۔

پھر چند سیکنڈ اور گزر گئے۔

اب جالب رشید کے پورے بدن میں تھرتھری دوڑنے لگی، لیکن اس کے ہونٹ اب بھی بند تھے۔ ہاتھ اب بھی جکڑے ہوئے تھے۔ بوچنگ کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔ اس نے گھبرا کر اپنی گھڑی پر سے نظریں ہٹا لیں اور بول اُٹھا:

"اوہ۔ اس نے شاید بٹن دبایا ہی نہیں۔"

"کیا!" اس کے ساتھی ایک ساتھ بول اُٹھے۔

"نن۔ نہیں۔" انسپکٹر جمشید اور ان کے ساتھیوں کے منہ سے نکلا۔

"میں دیکھتا ہُوں۔"

یہ کہ کر بوچنگ آگے بڑھا اور آلے کے بٹن کو چھو کر دیکھا۔

سب نے بوچنگ کو لڑکھڑا کر پیچھے ہٹتے دیکھا۔ خواب کی سی حالت میں اس کے منہ سے نکلا:

"بب۔ بٹن۔ دبا ہوا ہے۔"

اچانک انسپکٹر جمشید کے چہرے پر شدید حیرت کے آثار اُبھرے۔

دوسری شکست

پھر جوں ہی نصف منٹ پورا ہوا ، بوچنگ نے تھکی تھکی آواز میں کہا :

" میں ہار گیا - یہ آلہ ہار گیا - پروفیسر داؤد کا اسسٹنٹ جیت گیا "

" تو پھر - اب اس آلے کو ان کے سر پر سے اُتار لو " انسپکٹر جمشید مسکرائے ۔

" ہاں - ضرور "

" میں خود اُتارے دیتا ہوں " جالب رشید کے ہونٹ ہلے ، پھر اس کی اُنگلیاں کھل گئیں - اس نے بٹن آف کر دیا اور پیالہ سر پر سے اُتار دیا - پھر دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر بولا :

" پیالہ حاضر ہے "

" میں - میں ان لوگوں سے پروفیسر چین غوف کے بارے

میں معلوم نہیں کر سکتا " بوچنگ نے نفی میں سر ہلایا -

سبھی حیران تھے - لیکن سب سے زیادہ حیرت اور شکست بوچنگ کے چہرے پر نظر آ رہی تھی - ایسے میں فرزانہ کی نظریں اپنے والد کی طرف اُٹھ گئیں - ان کے چہرے پر حیرت کا ایک عجیب ہی عالم نظر آیا - اس حیرت میں اُلجھن بھی شامل تھی - اور اس اُلجھن نے اسے بھی چونک پڑنے پر مجبور کر دیا - اس نے اپنا منہ ان کی طرف کیا اور دبی آواز میں بولی :

" کیا ہوا ابّا جان ؟ "

" ایک عجیب بات - بہت ہی عجیب " انھوں نے بھی بہت دھیمی آواز میں کہا ، لیکن بوچنگ کے کانوں تک ان دونوں کی آوازیں پہنچ گئیں - اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا :

" کون سی بات عجیب ہے انسپکٹر ؟ "

" یہی بات کہ اس قدر تکلیف انھوں نے برداشت کر لی - اور پھر بھی منہ سے ہلکی سی آواز تک نہیں نکلی — ہاتھ ایک لمحے کے لیے بھی سر کی طرف نہیں بڑھے "

" یہ بات تو پہلے ہی سب کے لیے عجیب ہے — لیکن آپ ضرور کسی اور عجیب بات کا ذکر کر رہے تھے " بوچنگ نے کہا -

"تم کچھ بھی سمجھ سکتے ہو۔" انھوں نے کندھے اُچکائے۔

"خیر۔ اس پر بعد میں غور کریں گے۔ پہلے میں پروفیسر کے باقی ساتھیوں کو چیک کر لوں۔"

اب اس نے باقی عملے میں سے ایک کی طرف اشارہ کیا۔ پیالہ اس کے سر پر جُوں ہی رکھا گیا۔ وُہ چلّا اُٹھا:

"نن ۔ نہیں ۔ نہیں ۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

"بھئی ابھی تو بٹن دبا بھی نہیں ۔ پہلے ہی چلّا اُٹھے۔" بوچنگ بولا۔

"جب کچھ معلوم ہی نہیں تو بتاؤں گا کیا۔" وُہ بولا۔

"چلو بے ہوش تو ہو سکتے ہو نا۔"

بٹن دبا دیا گیا ۔ فوراً ہی وُہ چلّانے لگا ۔ اور پھر بے ہوش ہو گیا ۔ اسی طرح باری باری سب کارکُن بے ہوش ہوتے چلے گئے۔

"یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔" بوچنگ بڑبڑایا۔

"پھر ۔ اب کیا کیا جائے؟" اس کا ایک ساتھی بولا۔

"اس سے بُری شکست شاید ہم نے زندگی میں کبھی نہ کھائی ہو گی ۔ اس مرحلے پر میں باس سے گُفت گُو کرنے کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں ۔ اس کے لیے پہلے

تار جوڑنا ہو گا۔"

"میں ابھی جوڑ دیتا ہوں سر۔" ایک ساتھی نے کہا اور فون کے کٹے ہوئے تار کی طرف بڑھ گیا۔ جلد ہی اس نے تار جوڑ دیا۔

بوچنگ فون کی طرف بڑھا ہی تھا کہ انسپکٹر جمشید مُسکرا کر بولے:

"اس کا مطلب ہے ۔ تم جھوٹ بول رہے تھے ۔ تم جانتے ہو ۔ یہاں باس کون ہے۔"

"ہاں! لیکن ۔ صرف میں جانتا ہوں۔" اس نے کہا۔

اور فون پر نمبر ملانے لگا ۔ جلدی سلسلہ مل گیا:

"ہیلو باس ۔ یہ میں ہوں بوچنگ ۔ اوہ ۔ تو آپ جاگ رہے تھے ۔ جی ۔ جی ہاں ٹھیک ہے ۔ میری طرف سے رپورٹ سُنے بغیر آپ سو بھی کس طرح سکتے تھے ۔ جی ۔ جی ہاں ۔ لیکن سر ۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے ۔ میں آپ کو کوئی خوش خبری نہیں سُنا رہا ہوں ۔ جی ہاں ۔ میں پروفیسر چین غوث کے بارے میں ان سے کچھ بھی معلوم نہیں کر سکا ۔ جی ہاں ۔ تفصیل سُن لیں۔"

یہ کہہ کر اس نے تجربہ گاہ میں ہونے والی کارروائی کی پوری تفصیل سُنا دی اور پھر اپنے باس کی بات سُنتا

رہا ، پھر ریسیور رکھ کر ان سب پر ایک نظر ڈالی اور بولا:
" باس خود یہاں آ رہا ہے۔"

چند لمحے تک خاموشی طاری رہی ، پھر انسپکٹر جمشید مسکرا دیے:
" باس بھی آ کر کیا کر لے گا۔"
" باس بہت زیادہ ماہر ہے اس قسم کے معاملات کا۔ اس نے بہت بڑے لوگوں سے تربیت حاصل کر کے تمھارے ملک میں قدم رکھا تھا۔"
" ہوں - خیر - اسے بھی دیکھ لیتے ہیں۔"
" لیکن ابا جان - ہم میں سے اکثر تو بے ہوش ہیں — باس کو کیسے دیکھیں گے۔" فاروق بول اٹھا۔
" جو ہوش میں ہیں - وہ تو دیکھ لیں گے۔"
" مجھے تو ان کی مہم بالکل ناکام ہوتی نظر آتی ہے — جب پروفیسر چین غوف یہاں آئے ہی نہیں تو ان کے بارے میں کوئی بتا کیا سکتا ہے۔" محمود نے کہا۔
" چلو خیر - اسی بہانے ان کے باس سے ملاقات تو ہو

ہی جائے گی۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔
" صرف ملاقات ہی ہو گی - ان کا اصلی چہرہ تم لوگ نہیں دیکھ سکو گے۔" بوچنگ بول اٹھا۔
" ارے - تو کیا وہ نقاب کا بھی شوق رکھتے ہیں؟" فاروق نے کہا۔
" اور نہیں تو کیا تم لوگوں کے سامنے اصلی شکل میں آ جائیں گے۔"
" اور تم نے مسٹر بوچنگ ان کی اصلی شکل دیکھی ہے؟"
" ہاں - دیکھ چکا ہوں - کوئی ایک تو ایسا ہو گا ہی جو ان کے بارے میں جانتا ہو گا - ورنہ رابطہ قائم کرنے میں دقت ہوتی ہے۔"
" کیوں - وائرلیس کے ذریعے بات چیت کی جا سکتی ہے۔"
" ہاں ! یہ بھی ٹھیک ہے ، لیکن ہر جگہ وائرلیس ساتھ نہیں لے جایا جا سکتا - آج کل تمھارے ملک میں بہت سخت چیکنگ ہو رہی ہے۔" اس نے جواب دیا۔
آخر گھنٹی کی آواز نے انھیں چونکا دیا — پھر بوچنگ خود دروازہ کھولنے کے لیے دوڑ گیا — تین منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی - اس کے ساتھ ایک لمبے قد کا نقاب پوش تھا۔
" آپ لوگوں کو میرا آنا ناگوار تو گزرا ہو گا۔" اس -

بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"پتا نہیں۔ ناگوار گزرا یا خوش گوار۔ پہلے تو یہ بتائیے۔ یہ آواز آپ کی اصلی آواز ہے یا نقلی؟" فاروق نے منہ بنا کر کہا۔

"میں آواز بدل کر بات کر رہا ہوں۔ جانتا ہوں کہ مقابلے میں انسپکٹر جمشید اور ان کے بچے ہیں۔ ہاں تو میں یہاں موجود لوگوں میں سے صرف ان صاحب سے ملنا چاہتا ہوں جنھوں نے پیالہ اپنے ہاتھوں سے اپنے سر پر رکھا تھا اور میں چاہتا ہوں، ایک بار پھر وہ تجربہ میرے سامنے کیا جائے۔"

"اوہ!" انسپکٹر جمشید چونکے۔

"کیوں ابّا جان۔ آپ کو کیا ہوا؟" فرزانہ نے ان کی طرف دیکھا۔

"کک۔ کچھ نہیں۔" یہ کہ کر وہ نقاب پوش کی طرف مُڑے اور بولے:

"آپ یہاں صرف ان سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟"

"اس لیے کہ اس تجربہ گاہ میں سب سے زیادہ جرأت مند بھی ہیں۔"

"یہ بات ٹھیک نہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کیا مطلب۔ کیا بات ٹھیک نہیں؟" باس زور سے چونکا۔

"یہ کہ یہاں موجود تمام لوگوں میں یہ سب سے زیادہ جرأت مند ہیں۔"

"تو پھر۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"یہ کہ۔" ان سے زیادہ جرأت مند میں ہوں۔"

محمود، فاروق، فرزانہ اور خان رحمان زور سے چونکے، ایسی بات انھوں نے ان کے منہ سے زندگی میں پہلی مرتبہ سُنی تھی۔ وہ تو کبھی اپنی تعریف اپنے منہ سے نہیں کرتے تھے۔ ابھی وہ حیرت زدہ ہی تھے کہ نقاب پوش بول اُٹھا:

"میں سمجھا نہیں انسپکٹر صاحب۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"یہ کہ جس ہمت اور جرأت کا مظاہرہ انھوں نے کیا ہے، وہ کوئی خاص بات نہیں۔ ایسا مظاہرہ تو میں بھی کر سکتا ہوں۔"

"بہت خوب! پہلے ہم یہی کر لیتے ہیں۔" باس نے خوش ہو کر کہا۔

"پہلے سے آپ کی کیا مراد؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"آپ کے بعد پھر پیالہ ان کے سر پر رکھا جائے گا۔"

"حالاں کہ اس وقت اس کی ضرورت نہیں رہے گی، آپ کو یہ حیرت اسی بات پر ہے نا کہ ایک شخص کس طرح اس

پیالے کے ذریعے پہنچنے والی شدید تکلیف کو برداشت کرگیا۔"

"ہاں بالکل۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"بس تو پھر۔ اگر میں بھی برداشت کر گیا تو یہ بات حیرت کے قابل نہیں رہ جائے گی۔"

"ہوں! بات تو ٹھیک ہی لگتی ہے۔ خیر۔ یوں ہی سہی۔" یہ کہہ کر باس بوچنگ کی طرف مڑا:

"پیالہ ان کے سر پر فٹ کر دو۔ اور بٹن دبا دو۔"

"جی بہتر!" بوچنگ بولا۔

اور پھر اس نے پیالہ ان کے سر پر رکھ کر تسمہ کس دیا۔ محمود، فاروق، فرزانہ اور خان رحمان نے بے چین ہو کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرائے اور بولے:

"فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

پیالے کا بٹن دبا دیا گیا۔ چند سیکنڈ بعد انسپکٹر جمشید کا چہرہ سرخ ہوتا نظر آیا۔ ایسے میں فرزانہ کی نظریں جالب رشید کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ خوف بھی تھا اور وہ بہت بے چین نظر آ رہا تھا۔

ادھر انسپکٹر جمشید کے بدن میں تھرتھری دوڑنے لگی۔ ان کے پٹھے پھڑکنے لگے۔ ہونٹ انھوں نے مضبوطی سے بھینچ لیے۔ ان کا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔ پیشانی پر سے تو

پسینہ ٹپ ٹپ گرنے لگا۔

اور پھر تیس سیکنڈ گزر گئے۔ باس نے ہاتھ اوپر اٹھا دیا اور بولا:

"بس کرو بوچنگ۔ یہ ہماری دوسری شکست ہے۔"

فرزانہ نے جلدی سے جالب رشید کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ پرسکون انداز میں۔ گویا اسے بھی انسپکٹر جمشید کی جیت پر خوشی ہوئی تھی۔

"ہاں باس۔ ل۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"پتا نہیں۔ لیکن ہو چکا ہے۔ کہیں اس پیالے کی کارکردگی میں کوئی فرق تو نہیں پڑ گیا، اس کے گرم ہونے میں کوئی کمی تو واقع نہیں ہو گئی؟"

"نہیں باس۔ یہ اتنے آدمی جو بے ہوش ہوئے ہیں۔ آخر اس پیالے کے ذریعے ہوئے ہیں۔"

"ہوں! میرا خیال ہے۔ اس کی کارکردگی کو جانچنا ہو گا۔ بوچنگ ذرا تم اس کو اپنے سر پر رکھنا۔" باس نے کہا۔

"ج۔ جی۔ کیا فرمایا؟" بوچنگ گھبرا گیا۔

"اوہو بھئی۔ صرف دیکھیں گے کہ یہ کام کر رہا ہے یا نہیں۔" باس نے ہنس کر کہا۔

"اوہو باس۔ یہ بھی تو سوچیں کہ۔ اتنے لوگ یوں ہی

تو بے ہوش نہیں ہو گئے۔" بوچنگ نے جلدی سے کہا۔

"ہو سکتا ہے۔ یہ ایکٹنگ کر رہے ہوں۔"

"جج۔ جیسے آپ کی مرضی باس۔" بوچنگ نے گھبرا کر کہا۔

"گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ پیالہ اپنے سر پر کس لو۔ اور خود ہی بٹن دبا دو۔ جُوں ہی گرم ہونے لگے۔ بٹن آف کر دینا۔"

"جی بہتر!"

بوچنگ نے لرزتے ہاتھوں سے حکم کی تعمیل کی اور آخر بٹن دبا دیا۔

چند سیکنڈ بعد بوچنگ زور سے اُچھلا، ایک دل دوز چیخ اس کے منہ سے نکلی اور پھر اس نے بٹن آف کرنے کے لیے ہاتھ اُوپر اُٹھایا۔ لیکن اسی وقت پھر زور سے اُچھلا اور پھر تو وہ بُری طرح اُچھل کود رہا تھا:

"بب۔ باس۔ مَیں مرا۔ بٹن۔ بٹن۔"

"اوہ اچھا!" باس آگے بڑھا اور بٹن آف کر دیا۔

بوچنگ کے ہوش میں آنے میں کئی منٹ لگے۔

"یہ بات تو معلوم ہو گئی کہ آلہ ٹھیک کام کر رہا ہے، انسپکٹر جمشید نے یہ بات بھی ثابت کر دی کہ بہت بڑی

قوتِ برداشت کے لوگ بھی اس دُنیا میں موجود ہیں، لیکن ایک بات پر مجھے بھی یقین ہے۔ اور وہ کہ جالب رشید اتنی مضبوط قوتِ برداشت کا مالک نہیں ہو سکتا۔"

"پھر۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"کچھ بھی نہیں۔ میں تو ایک تجربہ کرنا چاہتا ہُوں۔ اور وہ یہ کہ جالب رشید کے سر پر ایک بار پھر یہ آلہ فٹ کیا جائے۔"

"لیکن باس! اب اس کی کیا ضرورت ہے۔"

"ضرورت ہے۔ تم نہیں سمجھتے بوچنگ۔" باس تیز لہجے میں بولا۔

"اگر آپ کا حکم یہی ہے تو مَیں آلہ اس کے سر پر رکھ دیتا ہُوں۔"

"ہاں ضرور۔ کیوں نہیں۔"

بوچنگ آلہ اُٹھا کر جالب رشید کی طرف بڑھا۔ اس نے وہ آلہ جالب رشید کے سر کی طرف اُٹھایا ہی تھا کہ فوراً اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ وہ دھڑام سے گرا اور بُری طرح تڑپنے لگا، پیالہ اس کے ہاتھوں سے نکل کر دُور لڑھک گیا۔

"یہ۔ یہ کیا ہوا؟" بوچنگ کے ایک ساتھی کے منہ

سے نکلا۔

اسی وقت بوچنگ چت ہو گیا۔ سب نے دیکھا کہ اس کے پیٹ میں ایک چاقو دستے تک دھنسا ہوا تھا، لیکن اس کا دستہ بہت ننھا سا تھا۔

"یہ۔ یہ چاقو۔ کہاں سے آیا؟" ایک ساتھی نے ہکلا کر کہا۔

"آپ سب لوگ اب ہاتھ اوپر اٹھا دیں۔ ہم لوگوں کے نہ صرف ہاتھ کھل چکے ہیں۔ بلکہ ہم اپنے پستول بھی نکال چکے ہیں، جب کہ آپ لوگوں نے لاپروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی گیس رائفلیں ایک طرف رکھ دی ہیں۔"

اور پھر مشینی انداز میں ان کے ہاتھ اوپر اٹھ گئے، انسپکٹر جمشید اور ان کے ساتھیوں کے ہاتھ واقعی کھل چکے تھے۔ اور یہ کارنامہ محمود کے چاقو کے ذریعے انجام دیا گیا تھا۔ محمود نے مسلسل کوشش کے بعد اپنے ہاتھ رسی کے بلوں سے آزاد کر لیے تھے۔

"میرا خیال ہے۔ اب ہمیں ان لوگوں کو بھی باندھ دینا چاہیے۔ تاکہ اطمینان سے اپنا کام کر سکیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اپنا کام۔ کیا مطلب؟" کئی آوازیں ابھریں۔

"پہلا کام تو یہ کہ یہ آلہ اب ذرا دیر کے لیے۔ مسٹر باس کے سر پر رکھا جائے گا اور ہم ان سے سوال کریں گے کہ۔ آلہ کام کر رہا ہے یا نہیں۔"

"نہیں۔" باس کے منہ سے نکلا۔

وُہ فرار ہو گیا

وُہ چند لمحے تک باس کی طرف دیکھتے رہے ، پھر مُسکرا کر بولے :

" کیوں نہیں مسٹر نہیں ! کیا آپ کے آدمیوں نے یہ ظُلم ہم پر نہیں توڑا — اب آپ کیوں اس آلے کا مزانہ چکھیں۔"

" ن — نہیں — نہیں۔" وُہ پھر چلّایا۔

" اب آپ نہیں کریں یا ہاں کریں — آلہ آپ کے سر پر ضرور رکھا جائے گا — چلو بھائی — انھیں باندھنے کا کام شروع کر دو۔" انھوں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔

" ضرور کیوں نہیں ابّا جان۔" محمُود نے مسکرا کر کہا اور پھر وُہ ان کی طرف بڑھے — رسیاں پہلے ہی موجود تھیں — جن سے انھیں باندھا گیا تھا — اب انھی رسیوں سے انھیں باندھا جا سکتا تھا —

لیکن ابھی وُہ ان کی طرف بڑھے ہی تھے کہ باس

نے اپنا پیَر زور سے فرش پر مارا — ایک دھماکا ہوا ، گہرا دُھواں آن کی آن میں کمرے میں بھر گیا — انسپکٹر جمشید نے فوراً کمرے کے دروازے کی طرف چھلانگ لگا دی اور باہر نِکل آئے — لیکن فوراً ہی انھوں نے محسوس کر لیا کہ باس نِکل بھاگا تھا — وُہ بیرونی دروازے کی طرف دوڑے ، لیکن انھیں دیر ہو چکی تھی — باس کا دُور دُور تک پتا نہیں تھا — اب وُہ اندر کی طرف دوڑے — دُھواں چھٹ چکا تھا — وُہ فوراً بوچنگ پر جُھک گئے — اس کے جسم کا خُون چاروں طرف پھیل گیا تھا اور وُہ اپنے ہی خُون میں لت پت آخری سانس لے رہا تھا —

" مسٹر بوچنگ — اپنے باس کا نام بتا دو۔"

" م — میں — میں۔" اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

" ہاں شاباش — باس کا نام کیا ہے؟"

وُہ چند لمحے تک پتھرائی ہوئی آنکھوں سے انھیں دیکھتا رہا ، پھر اس کی گردن ڈھلک گئی :

" افسوس ! بوچنگ مر گیا — باس کا نام صرف اسے معلوم تھا — اور وُہ فرار ہو چکا ہے — اب ہم کیا کریں؟"

" اللہ کا شکر۔" فارُوق نے فوراً کہا۔

"ہاں! تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمیں ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔"

"ویسے ابا جان۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ پروفیسر چین غوف یہاں نہیں تھے۔ ورنہ پروفیسر انکل بتا چکے ہوتے۔"

"نہیں بھئی۔ تم اپنے پروفیسر انکل کو اتنا کمزور نہ سمجھو۔"

"چلیے خیر۔ ان کے اسسٹنٹ تو بتا ہی دیتے۔"

"ہاں! یہ کہا جا سکتا ہے۔ پہلے تو ہمیں اپنے بے ہوش ساتھیوں کو ہوش میں لانا چاہیے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

تھوڑی دیر بعد سب ہوش میں آ چکے تھے ــــ تجربہ گاہ کا بیرونی دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔ اکرام کو فون کر کے سادہ لباس والے طلب کر لیے گئے تھے، پھر اکرام اور اس کے ماتحت بھی وہاں پہنچ گئے۔ ایسے میں انسپکٹر جمشید نے پروفیسر داؤد سے کہا:

"چلیے۔ اب تو بتا دیں۔ پروفیسر چین غوف کہاں ہیں؟"

"کیا کہ رہے ہو جمشید۔ کیا تم یہ خیال کر رہے ہو کہ مجھے ان کے بارے میں معلوم ہے۔"

"جی ہاں! میرا تو خیال یہی ہے۔"

"نہیں۔ تمھارا خیال غلط ہے۔"

"اگر میرا خیال غلط ہے تو پھر ایک بہت ہی عجیب

بات کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جائیے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"آپ ایک عجیب بات کی بات کر رہے ہیں ابا جان، ہم تو جب سے یہاں آئے ہیں۔ عجیب ہی باتیں سن رہے ہیں۔" فاروق بولا۔

"لیکن وہ بات ان سب باتوں سے زیادہ عجیب ہو گی۔" انھوں نے کہا۔

"خیر۔ پھر ہم سننے کے لیے تیار ہیں۔"

"پروفیسر چین غوف واقعی ہمارے ملک میں کہیں موجود ہیں۔"

"کیا۔ نہیں!!!" ان سب کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا۔

"ہاں! میں دعوے سے کہ سکتا ہوں کہ پروفیسر چین غوف یہیں موجود ہیں۔"

"یہ۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے جمشید۔ میری تجربہ گاہ میں پروفیسر چین غوف موجود ہوں اور مجھے معلوم نہ ہو۔" پروفیسر داؤد نے بُرا سا منہ بنایا۔

"بالکل ہو سکتا ہے۔ میں ثابت کر سکتا ہوں۔"

"تو پھر کر دو نا ثابت جمشید۔ مارے بے چینی کے میرا بُرا حال ہے۔" خان رحمان بولے۔

"آپ کے اسسٹنٹ خالد فاروق اور جالب رشید کب سے

آپ کے ساتھ کام کر رہے ہیں ؟"

" کک - کیوں - یہ کیوں پوچھا آپ نے ؟"

" پہلے آپ میری بات کا جواب دیں ، پھر بتاؤں گا۔" وہ مسکرائے -

" خالد فاروق بہت پرانے ہیں - جالب رشید کو ابھی چند ماہ پہلے ملازم رکھا گیا ہے۔"

" اور انھیں کس کی ضمانت پر ملازم رکھا گیا تھا ؟"

" اوہ !" پروفیسر داؤد کے منہ سے نکلا - ان کے چہرے پر حیرت کے آثار پھیل گئے -

" یہ آپ نے میرے سوال کا جواب دیا ہے۔" انسپکٹر جمشید حیران رہ گئے -

" ایک بات ابھی اور اسی وقت یاد آئی ہے - اور وہ بہت ہی عجیب بات ہے۔"

" جہاں ہم موجود ہوں - وہاں کم عجیب باتوں کا کیا کام - وہ بے چاری تو دم دبا کر بھاگ جاتی ہیں۔" فاروق مسکرایا -

" کون بھاگ جاتی ہیں دم دبا کر ؟" پروفیسر داؤد نے بے دھیانی کے عالم میں کہا -

" جی - کم عجیب باتیں۔"

" آپ وہ عجیب بات بتا رہے تھے۔" انسپکٹر جمشید جلدی سے بولے ، ساتھ ہی انھوں نے فاروق کو گھورا -

" ہاں ! جالب رشید کو پروفیسر چین غوف کی سفارش پر رکھا گیا تھا۔"

" کیا !!!" وہ ایک ساتھ بولے -

" ہاں ! بالکل یہی بات ہے۔" انھوں نے کہا -

" اور سفارش کس صورت میں ملی تھی آپ کو ؟"

" تحریر کی صورت میں - جالب رشید خود ان کا خط لے کر یہاں آئے تھے۔"

" جالب رشید صاحب - آپ نے جب پروفیسر چین غوف سے رقعہ لیا ، اس وقت وہ کہاں تھے ؟"

" جج - جی - یہیں موجود تھے۔"

" یہیں سے آپ کی کیا مراد ہے ؟" انھوں نے پوچھا -

" ہمارے ملک میں۔"

" آپ سے ان کی ملاقات کیسے ہو گئی اور کہاں ؟"

" سائنس کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میری ان سے کئی بار ملاقات ہو چکی تھی - اتفاق سے وہ مجھے یہاں نظر آ گئے - میں ملازمت حاصل کرنے کے چکر میں تھا - بس میں نے ان سے رقعہ لکھوا لیا۔"

"آپ نے یہ نہیں بتایا کہ ملاقات کہاں ہوئی تھی ؟" انھوں نے پھر پوچھا ۔

"جج ۔ جی ۔ وہ ۔ ملاقات"

"ہاں ۔ ملاقات ۔ کہاں ہوئی تھی ؟"

"سرِ راہ" اس نے کہا ۔

"بس ۔ اب اور جھوٹ نہ بولیں"

"جی ۔ کیا مطلب" پروفیسر داؤد اور دوسرے حیرت زدہ انداز میں بولے ۔

"جھوٹ ۔ کیا مطلب" پروفیسر داؤد نے پھر کہا ۔

"جب ان کے سر پر آلہ رکھا جانے لگا تو انھوں نے جرأت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ لائیے ۔ میں پیالہ خود اپنے سر پر رکھوں گا ۔ بلکہ بٹن بھی انھوں نے خود اپنے ہاتھ سے دبایا اور پھر بٹن دبانے کے بعد ان کا چہرہ سُرخ ہونے لگا ۔ بدن میں تھرتھری دوڑ گئی ۔ اس حالت میں نصف منٹ گزر گیا ۔ یہ بے ہوش نہیں ہوئے ۔ چیخے اور چلائے بھی نہیں ۔ یہاں تک کہ آلہ اُتار لیا گیا ۔ لیکن بات دراصل کچھ اور تھی" انسپکٹر جمشید مسکرائے ۔

"اور وہ کیا تھی ؟" فرزانہ بے تابانہ بولی ۔

"یہ کہ اس وقت آلہ کام ہی نہیں کر رہا تھا ۔"

"جی ۔ کیا مطلب ۔ آلہ کام نہیں کر رہا ہے ، لیکن انھوں نے تو بٹن ہم سب کے سامنے دبایا تھا" کئی آوازیں اُبھریں ۔

"یہ ٹھیک ہے ۔ انھوں نے بٹن سب کے سامنے دبایا تھا ، لیکن اس کے باوجود آلے نے کام نہیں کیا تھا ۔ اگر آلہ کام کر رہا ہوتا ۔ تو ۔ چلیے ۔ میں مان لیتا ہوں ۔ بہت زبردست قوّتِ برداشت کا آدمی اس آلے کی تکلیف کو برداشت کر جائے ۔ لیکن ایک بات ہرگز نہیں ہو سکتی" یہاں تک کہہ کر وہ رک گئے ۔

"اور ۔ وہ کیا ؟" کئی آوازیں اُبھریں ۔

"یہ کہ ان کی پیشانی پر پسینے کا ایک قطرہ تک نہیں تھا ۔ سر پر آگ کی طرح گرم ایک پیالہ موجود ہو ۔ جس کی وجہ سے دماغ کھولنے لگ جائے ۔ تمام جسم ہنڈیا کی طرح کھولنے لگے ۔ اور ایک شخص کی پیشانی پر پسینہ نہ آئے ۔"

"اوہ !" ان سب کے منہ سے نکلا ۔

"میں نے بھی آلے کی تکلیف برداشت کی ہے ۔ آواز میں نے بھی اپنے منہ سے نہیں نکلنے دی ، لیکن میرا پورا بدن پسینے سے بھیگ گیا تھا اور خاص طور پر پیشانی پر تو بہت ہی زیادہ پسینہ تھا ۔ لیکن آپ لوگوں کو یاد ہو گا کہ

ان کے چہرے پر پسینے کا ایک قطرہ تک نہیں تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب ہے۔ اس وقت آلہ کام نہیں کر رہا تھا۔"

"لیکن کیسے۔ بٹن تو دبایا گیا تھا۔"

"اگر کوئی شخص آلے سے اس حد تک واقف ہو۔ کہ آلہ استعمال کرنے والے بھی واقف نہ ہوں تو وہ شخص ضرور کوئی چکر چلا سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آلہ پروفیسر چین غوف کے ہاتھ کا بنایا ہوا ہے۔ کیوں مسٹر جالب رشید۔ آپ کیا کہتے ہیں اس بارے میں؟"

"آپ کے اندازے سُن کر حیرت کے سمندر میں غوطے کھا رہا ہوں۔ کبھی ڈوب رہا ہوں تو کبھی ابھر رہا ہوں۔" جالب رشید نے مسکرا کر کہا۔

"مہربانی فرما کر میرے سوال کا جواب دیں۔"

"ہاں! اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ آلہ پروفیسر چین غوف کا بنایا ہوا ہے۔ اور اس میں ایک لاک بھی ہے۔ اگر اس کو دبا دیا جائے تو بٹن دبانے کے باوجود کام نہیں کرتا۔"

"اوہ۔ اوہ۔" ان سب کے منہ سے نکلا۔

"تو کیا۔ مسٹر چین غوف نے آپ کو اس آلے کے بارے میں بتا دیا تھا؟"

"جی ہاں!"

"نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"تو پھر کیا بات ہے؟"

"جالب رشید خود پروفیسر چین غوف ہیں۔"

"کیا!!!" وہ سب ایک ساتھ چلّائے۔

مارے حیرت کے ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اوپر کے سانس اوپر اور نیچے کے نیچے رہ گئے۔ قریباً ایک منٹ تک کسی کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل سکا، پھر پروفیسر داؤد اس طرح بولے جیسے خواب کی حالت میں بول رہے ہوں:

"یہ۔ یہ میں نے کیا سُنا ہے۔ اور کیا یہ درست ہے، جالب رشید کے رُوپ میں دراصل یہاں پروفیسر چین غوف موجود ہیں۔ مم۔ میرے اسسٹنٹ کے طور پر۔ نہیں۔ جمشید۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"آپ مسٹر جالب رشید کی طرف ایک نظر دیکھ لیں۔ پھر بات کریں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

پروفیسر داؤد نے جلدی سے ان کی طرف دیکھا۔

جالب رشید بھرپور انداز میں مُسکرا رہے تھے اور اُن کی مُسکراہٹ سب سے کہ رہی تھی - یہ ٹھیک ہے - میں ہی پروفیسر چین غوث ہُوں ـ

" اوہ - اوہ " پروفیسر داؤد بولے ـ

" لیکن پروفیسر صاحب - آپ کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی - آپ ہماری حکومت سے پناہ طلب کر سکتے تھے " انسپکٹر جمشید بولے ـ

" اس صُورت میں - آپ کی حکومت پر دباؤ ڈالا جاتا کہ مجھے ان کے حوالے کیا جائے - ورنہ وُہ یہ کریں گے، وُہ کر دیں گے - یا پھر وُہ اغوا کرانے کی کوشش کرتے - اب بھی دیکھ لیں - وُہ بالکل ٹھیک جگہ پر آ گئے تھے، لیکن مَیں نے چُوں کہ یہاں خود کو ظاہر نہیں کیا تھا، اس لیے کامیاب نہ ہو سکے "

" اور اب - اب تو آپ ظاہر ہو چکے ہیں " خان رحمان بولے ـ

" کوئی بات نہیں - اب حفاظتی انتظامات کر لیے جائیں گے "

" لیکن پروفیسر صاحب - آپ نے یہ نہیں بتایا کہ وہاں سے فرار کی کیا وجہ تھی ؟ "

" میں اسلام سے متاثر ہو چکا تھا - اور غیر مسلموں کے لیے اب کام کرنا میرے بس سے باہر تھا - بس مَیں وہاں

سے نکل آیا - اور میک اَپ کر کے نکلا " انھوں نے کہا ـ

" سب کام ہی ٹھیک ہو گیا - بس ایک بات غلط ہو گئی، اور وُہ یہ کہ باس فرار ہو گیا " محمود بولا -

" ہاں ! میں بھی اس کے بارے میں یہی سوچ رہی ہوں، خیر کوئی بات نہیں - اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ کیا جائے گا - ارے ہم بے چاری شائستہ کو تو بھول ہی گئے - الگ کمرے میں بند ہے وُہ غریب " فرزانہ نے تیز آواز میں کہا -

اور پھر تینوں بند کمرے کی طرف دوڑ پڑے ـ

اعزاز جیت لیا

دُوسرے دن کے اخبارات پروفیسر چین غوف کی خبروں سے بھرے ہوئے تھے۔ پروفیسر داؤد کی تجربہ گاہ میں ہونے والے ڈرامے کی تمام تر تفصیلات درج کی گئی تھیں، پروفیسر چین غوف کے اسلام لانے کا ذکر بھی تھا۔ ان کا الگ ایک بیان بھی شائع ہوا تھا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ اب وُہ اپنے اس مُلک کے لیے کام کریں گے اور پروفیسر داؤد کے شانہ بشانہ کام کریں گے۔ رہ گیا وِنٹاس۔ اگر اس نے ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھا تو حکومت کی طرف سے اعلان کیا گیا تھا۔ وُہ آنکھ نکال دی جائے گی۔ کوئی ہاتھ ان کی طرف بڑھا تو اسے کاٹ دیا جائے گا۔ ان سب باتوں سے زیادہ دل چسپ ایک پروگرام تھا۔ انتظامیہ کی طرف سے پروفیسر چین غوف کے مسلمان ہونے اور مُلک کے لیے کام کرنے کے اعلان کی خوشی میں تمام بڑے بڑے

آفیسرز کو ایک دعوت ایوانِ صدر میں دی گئی تھی۔ اور یہ دعوت آج شام عشا کے بعد ہو رہی تھی۔

سارے شہر نے ان خبروں کو خوشی اور جوش کی حالت میں پڑھا۔ بیرونِ مُلک بھی یہ خبریں اخبارات میں شائع ہوئیں۔ ان میں وِنٹاس کا خوب مذاق اڑایا گیا تھا، حالانکہ مذاق اڑانے والی تو کوئی بات نہیں تھی۔

محمود، فارُوق اور فرزانہ شام سے ہی اس دعوت کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ اس دوران محمود نے کہا:

"ہم لوگ باس کو تو بھُول ہی گئے۔"

"نہیں۔ بھولے تو نہیں۔ بس اس دعوت سے فارغ ہو لیں، پھر باس کی تلاش میں نِکلیں گے۔" فارُوق نے کہا۔

"ہم دعوت میں کیوں شریک ہوں۔ باس کی تلاش کیوں نہ کریں۔" محمُود نے کہا۔

"ہو سکتا ہے۔ باس بھی دعوت میں شریک ہو۔" فرزانہ مُسکرا کر بولی۔

"اوہ!" ان کے منہ سے نِکلا، پھر ان کے چہروں پر حیرت کے آثار نمودار ہو گئے۔ اسی وقت انسپکٹر جمشید غسل خانے سے نِکلتے نظر آئے:

"ابا جان۔ کیا یہ دعوت آپ کی تجویز پر دی جا رہی ہے؟"

"تم نے یہ اندازہ کس طرح لگایا؟" وہ مسکرائے۔

"کیا کیا جائے۔ ٹوٹے پھوٹے اندازے تو ہم بھی لگا ہی لیتے ہیں۔" فاروق نے منہ بنایا۔

"تب پھر سُن لو۔ تمھارا ٹوٹا پھوٹا اندازہ درست ہے۔"

"ویری گڈ۔ تو یہ دراصل جال بچھایا گیا ہے۔"

"ہاں۔ میں نے سوچا۔ ہم باس کو کیوں تلاش کرتے پھریں۔ وہ خود کیوں نہ ہماری طرف چلا آئے۔"

"لیکن اس طرح پروفیسر چین غوف کی زندگی خطرے میں ہو گی۔ اگر ہم باس کو نہ پہچان سکے اور اس کا وار کارگر ہو گیا تو۔" فاروق نے اعتراض کیا۔

"اس سلسلے میں بھی حفاظتی انتظام کر لیا گیا ہے۔"

"چلیے۔ تب تو ٹھیک ہے۔" انھوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"اور کیا ہم بھی اپنی پوری تیاری کر کے جائیں؟"

"ہاں بالکل۔ اس کی ضرورت ہے، کیوں کہ ہمیں نہیں معلوم کہ باس کون ہے۔ وہ پروفیسر پر وار کرنے کی پوری پوری کوشش کرے گا، دوسرے یہ کہ۔ آخر وہ بھی ونٹاس کا جاسوس ہے۔ اور ہمارے ہاتھوں چوٹ کھایا ہوا ہے، لہٰذا سوچ سمجھ کر ہی وار کرے گا۔"

"ہُوں! تب تو ہمیں بھی پوری طرح تیار ہو کر جانا چاہیے، ویسے تو آپ وہاں ہوں گے ہی۔" محمود نے کہا۔

"یہ بات ٹھیک نہیں۔ میرے ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ چوک ہر کسی سے ہو سکتی ہے۔ وہ ہماری کسی چوک سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرے گا، ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کا وار کس رُخ سے ہو گا۔ وہ کیا طریقہ کار اختیار کرے گا۔"

"ابا جان۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ خود نہ آئے۔ اور کسی طرح کوئی بم وغیرہ اندر رکھوا دے۔"

"اِس پہلو پر بھی غور کیا جا چکا ہے۔ اور انتظامات کر لیے گئے ہیں کہ کوئی بم اندر نہ پہنچایا جا سکے۔"

"بہت خوب۔ تب تو ہمیں نئے سرے سے تیاریاں کرنا ہوں گی۔"

"ضرور کیوں نہیں۔ لیکن میں تمھارے انتظار میں رُک نہیں سکتا۔ مجھے اور بہت کام ہیں۔ تم ٹھیک نو بجے پہنچ جانا۔" انھوں نے کہا۔

"بہت بہتر!"

★

ٹھیک نو بجے وہ ایوانِ صدر کے دروازے پر پہنچ گئے،
یہاں زبردست حفاظتی انتظامات تھے اور سخت چیکنگ
ہو رہی تھی — اندر جانے والے ایک قطار میں اندر داخل
ہو رہے تھے اور انھیں پوری طرح چیک کیا جا رہا تھا —
آخر ان کی باری آئی:

"آپ کے کارڈ؟"

انھوں نے کارڈ دکھائے اور اندر داخل ہو گئے — سب
لوگ گھاس پر ٹہل رہے تھے — یا آرام کرسیوں پر بیٹھے
تھے — مہمانوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا — جس ہال میں
دعوت دی جانی تھی — اس کے تمام دروازے بند تھے —
آنے والے مہمانوں میں انھیں پروفیسر چین غوف کہیں بھی
نظر نہیں آ رہے تھے:

"پروفیسر صاحب — شاید سب سے آخر میں آئیں گے۔"
محمود بڑبڑایا۔

"بہتر بھی یہی ہے۔" فاروق بولا۔

"ہیلو — کیا ہو رہا ہے بھئی۔" انھوں نے پروفیسر داؤد
کی آواز سُنی — ان کی طرف پلٹے تو ساتھ میں خان رحمان بھی
نظر آئے —

"اوہو — دونوں انکل ایک ہی جگہ موجود ہیں۔"

"ہاں! اب تم بھی شامل ہو چکے ہو۔" پروفیسر مسکرائے۔

"لیکن — پروفیسر چین غوف نظر نہیں آ رہے۔"

"پتا نہیں — وہ کہاں ہیں — تجربہ گاہ سے تو انھیں انسپکٹر
جمشید لے آئے تھے۔"

"خود ابّا جان بھی ابھی یہاں نظر نہیں آ رہے۔"

"ابھی دعوت میں دیر بھی تو کافی ہے — مہمانِ خصوصی بھی
ابھی نہیں پہنچے۔" خان رحمان بولے۔

"یعنی صدرِ مملکت — تو اس تقریب کے مہمانِ خصوصی
وہ ہیں۔" فرزانہ بولی۔

"ہاں! بالکل — صدر صاحب بھی پروفیسر صاحب کے آنے
کی وجہ سے بہت خوش ہیں۔"

"لیکن وشاس ضرور پریشان کرے گا۔" پروفیسر داؤد بولے۔

"نہیں — اس مسئلے پر بات ہو چکی ہے — وشاس کھلم کھلا
کوئی دھمکی نہیں دے سکتا، کیوں کہ پروفیسر چین غوف اپنی
مرضی سے یہاں آئے ہیں — اور اسلام بھی انھوں نے اپنی
مرضی سے قبول کیا ہے — ان کا بیان چھپ چکا ہے —
دوسرے یہ کہ غیر ملکی نمائندے ان سے انٹرویو لے چکے
ہیں اور دنیا بھر کے ریڈیو وہ انٹرویو نشر کر چکے ہیں —
ان حالات میں وشاس کچھ بھی نہیں کر سکتا — ہاں — خفیہ طور

پر ضرور انھیں ختم کرانے کی کوشش کرے گا۔ اور اس
کے لیے ہم چوکس ہیں۔" خان رحمان جلدی جلدی کہ گئے۔
" ونتاس کے جاسوس کو بھی یہ سب اندازے ہوں گے۔
یہاں داخلہ تو اس کے لیے کوئی مسئلہ ہی نہیں ہو گا، کیوں کہ
دعوتی کارڈ تو اسے ملا ہی ہو گا۔ لہٰذا اندر آ کر وہ بھی
اپنے سوچے سمجھے منصوبے پر عمل کرے گا۔"
" خیر۔ دیکھا جائے گا۔ کیا ہوتا ہے۔"
اسی وقت انھوں نے ایک شخص کو اندر آتے دیکھا۔ اس
کے ہونٹوں میں پائپ دبا ہوا تھا۔ پائپ سے دھواں اُٹھ
رہا تھا۔ اور وہ جلدی جلدی کش لگا رہا تھا۔ آنکھوں پر
عینک بھی تھی۔ دونوں ہاتھ تیزی سے آگے پیچھے ہو رہے
تھے۔ اس کے چلنے کی رفتار تو اتنی نہیں تھی۔ ہاتھ ضرور
تیز رفتاری سے چل رہے تھے۔ نہ جانے کیوں۔ ان کی
نظریں۔ اس پر چپک کر رہ گئیں:
" میری چھٹی حس مجھے خبردار کر رہی ہے۔" فرزانہ بڑبڑائی۔
" ہاں! واقعی۔ یہ آدمی مشکوک لگتا ہے۔"
" تو آؤ۔ اس سے دو دو باتیں کر لیں۔"
" ہوں ٹھیک ہے۔ انکل۔ ہمیں اجازت ہے؟"
" بھئی۔ تم جانو۔ یہ تمھارا کام ہے۔ ہم کیا کہ سکتے

ہیں۔" پروفیسر داؤد مسکرائے۔
" شکریہ!"
اور تینوں اس کی طرف بڑھنے لگے:
" ہیلو سر۔ آپ کی تعریف؟" محمود نے میٹھے لہجے میں کہا۔
" کک۔ کیا بات ہے؟" وہ گھبرا گیا۔
" میں نے پوچھا ہے۔ آپ کا نام نامی کیا ہے؟" محمود
نے کہا۔
" لیکن۔ کیوں پوچھا ہے؟"
" بس ایسے ہی۔ کیا آپ کو کوئی اعتراض ہے؟"
" ہونا تو چاہیے۔" اس نے منہ بنا کر کہا۔
" وہ کیسے۔ یعنی کیوں ہونا چاہیے اعتراض۔" فارُوق بولا۔
" کیا آپ ہر آنے والے مہمان سے یہ سوال کر رہے ہیں؟"
" جی نہیں۔ بس ہم کسی کسی سے یہ سوال کر رہے
ہیں۔"
" آخر کیوں۔ اس کی کیا ضرورت ہے۔ یہاں تو سب
معزز لوگ ہیں۔" اس نے بھنّا کر کہا۔
" جی ہاں! اس میں کیا شک ہے، لیکن اگر معزز
لوگوں میں کوئی غیر معزز شامل ہو گیا تو جانتے ہیں،
کیا ہو گا؟" فارُوق نے بھی اسی کے لہجے میں کہا۔

"تو کیا ہوگا؟" اس نے آنکھیں نکالیں۔

"ہوگا یہ جناب کہ پروفیسر چین غوف کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے گی اور اگر ایسا ہوگیا تو ہم تو پوری دُنیا میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ ساری دُنیا طعنے دے گی کہ ہم اپنے ایک نو مسلم کی حفاظت نہ کر سکے۔"

"اوہ۔ واقعی۔ یہ تو بہت افسوس ناک بات ہوگی۔ لیکن اس بات کا مجھ سے کیا تعلق؟" اس نے بھنّا کر کہا۔

"فرض کیجیے۔ آپ ہی ونٹاس کے جاسوس ہیں۔ اور۔ اور۔"

"آپ میری بے عزتی کر رہے ہیں۔" اس نے تلملا کر کہا۔

"جی نہیں۔ آپ صرف اپنا نام بتا دیں اور کارڈ دکھا دیں۔ بس ہم آپ سے کوئی اور غرض نہیں رکھیں گے۔"

"تو پھر سُن لیں۔ میرا نام لیاقت کنور ہے۔ سیکرٹری ہوں وزیرِ داخلہ کا۔"

"شکریہ جناب۔" محمود جلدی سے بولا۔

"شاید اب آپ کا شک دُور ہوگیا۔"

"یہی سمجھ لیں۔ آپ نے اپنا کارڈ اب تک نہیں دکھایا۔"

"آپ بہت شکی مزاج ہیں۔ یہ لیجیے۔" اس نے دعوتی

کارڈ نکال کر ان کے سامنے کر دیا۔ انھوں نے کارڈ پر لکھے نام پر ایک نظر ڈالی، پھر محمود نے کہا:

"یہ تو ہوگیا دعوتی کارڈ۔ ہم شناختی کارڈ کی بات کر رہے ہیں۔"

"اوہ اچھا۔ ضرور۔ کیوں نہیں۔" اس نے بُرا سا منہ بنا کر کہا اور پھر اپنا شناختی کارڈ بھی نکال کر دکھا دیا۔ وُہ واقعی لیاقت کنور تھا۔ اور وزیرِ داخلہ کا سیکرٹری بھی۔

عین اُسی وقت ایک شخص محمود سے ٹکرا گیا۔ محمود بھنّا کر پلٹا:

"دیکھ کر تو چلیے جناب۔" اس نے تیز آواز میں کہا۔

"مم۔ معاف کر دیں۔ جی۔ جی ہاں۔" وُہ بولا۔

"معاف کر دیں۔ جی ہاں۔ یہ کیا بات ہوئی۔ میرا مطلب ہے۔ یہ جی ہاں کہاں سے آگیا۔" فاروق نے اسے گھورا۔

"بس۔ معاف کر دیں۔ مہربانی۔"

"اوہ۔ تب تو معاف کیجیے گا۔" محمود نے فوراً کہا۔

انھوں نے دیکھا۔ وُہ ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک تھی۔

"کک۔ کوئی بات نہیں۔" اس نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

"ایک منٹ جناب!" فرزانہ چلّائی۔

وُہ چونک کر مُڑا :

" اب کیا ہوا "۔

" آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ آپ کا نام کیا ہے ؟"

" کیوں ! اس کی کیا ضرورت ہے ۔ کیا آپ یہاں سی آئی ڈی آفیسر لگے ہوئے ہیں ؟"

" ہاں بس ۔ یہی سمجھ لیں "۔ فارُوق مُسکرایا۔

" سمجھ لیں سے آپ کی کیا مُراد "۔ اس نے آنکھیں نکالیں۔

" ہمیں اندر کی چیکنگ پر مقرر کیا گیا ہے "۔ محمود نے کہا۔

" اس عمر میں "۔ وُہ حیران ہو کر بولا۔

" جی ہاں ! کیا آپ کو اعتراض ہے "۔

" پتا نہیں ۔ اعتراض ہونا چاہیے یا نہیں ۔ بہرحال میں اپنے وزیر صاحب سے بات کروں گا "۔

" کیا آپ کسی وزیر کے سیکرٹری ہیں ؟"

" میں سیکرٹری نہیں ہوں ۔ بیرونی تجارت کا ناظمِ اعلیٰ ہوں "۔

" اوہ اچھا ۔ اب اگر آپ نام نہ بتائیں تو بھی کوئی حرج نہیں ۔ کیوں کہ ہم کسی سے بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ بیرونی تجارت کے ناظمِ اعلیٰ کا کیا نام ہے "۔

" ہاں کیوں نہیں ۔ ہر کوئی فوراً کہ دے گا عادل پرویز

ٹکرائی ۔ ارے ۔ میں تو آپ کو اپنا نام بتا گیا "۔

" چلیے خیر ۔ کوئی بات نہیں ۔ ویسے کیا آپ کی نظر کمزور ہے جناب ؟"

" نن ۔ نہیں تو ۔ یہ کس احمق نے کہ دیا آپ سے "۔

" آپ مجھ سے ٹکرائے کیوں تھے ؟" محمود مسکرایا۔

" وُہ ۔ وُہ تو میں لڑکھڑا گیا تھا "۔ اس نے جھینپ کر کہا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتا آگے بڑھ گیا ۔

اب جو وُہ مُڑے تو لیاقت کنور بھی وہاں نہیں تھا۔ دُور ایک کونے میں بیٹھا نظر آیا :

" ان دونوں کے بارے میں کیا خیال ہے "؟ محمود بولا۔

" بہت شریف اور سیدھے سادے آدمی نظر آتے ہیں "۔ فارُوق نے جواب دیا۔

" لیکن میں تو ایسا نہیں سمجھتا "۔

" تمھارے سمجھنے نہ سمجھنے سے کیا ہوتا ہے "۔ فارُوق نے منہ بنایا ۔

" حیرت ہے ۔ ابھی تک ابّا جان "۔

فرزانہ کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے ۔ اسی وقت ان کی نظریں اپنے والد پر پڑی تھیں ۔ وُہ صدر صاحب کے ساتھ چلے آ رہے تھے ۔ ان کی طرف دیکھ کر مسکرا دیے ۔

اسی وقت صدر صاحب نے بھی انھیں دیکھ لیا:

"اوہو — تم لوگ بھی موجود ہو — کیا حال ہیں؟"

"جی بس — اللہ تعالیٰ کا احسان ہے۔" محمود نے شرما کر کہا۔

"مہمانوں پر نظر رکھی یا نہیں؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی ہاں! ایک ایک کو بغور دیکھتے رہے ہیں۔"

"پھر — کوئی غلط آدمی نظر آیا یا نہیں؟"

"کچھ نہیں کہا جا سکتا — یُوں سمجھ لیں کہ ابھی تک مکمل طور پر غلط آدمی کوئی نظر نہیں آیا۔"

"پروفیسر چین غوف ابھی تک کہیں نظر نہیں آئے ابا جان۔" فرزانہ بولی۔

"وُہ — وُہ بہت پہلے آ چکے ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے مُسکرا کر کہا۔

"جی — کیا مطلب — ہمیں تو کہیں نظر آئے نہیں۔"

"آ بھی کیسے سکتے تھے۔"

"تت — تو کیا وُہ یہاں میک اپ میں ہیں۔" فرزانہ نے پُوچھا۔

"ہاں! یہی سمجھ لو۔" انھوں نے کہا۔

آخر سب لوگ تقریب والے کمرے میں داخل ہوئے، ایسے میں کسی نے کہا:

"یہ کس قدر عجیب بات ہے — جن کے اعزاز میں یہ دعوت دی گئی ہے، وُہ کہیں بھی نظر نہیں آ رہے۔"

انھوں نے فوراً یہ کہنے والے کی طرف دیکھا، انھیں قدرے حیرت ہوئی — وُہ لیاقت کنور تھا —

"فکر نہ کریں کنور صاحب — ہمارے معزز مہمان یہاں موجود ہیں — بلکہ بہت پہلے سے موجود ہیں۔"

"کیا مطلب — یہ کیا بات ہوئی؟" لیاقت کنور نے حیران ہو کر کہا۔

"وُہ یہاں میک اپ میں موجود ہیں — کیوں کہ اس دعوت میں ان پر قاتلانہ حملے کا امکان ہے۔"

"اوہ!" بیسیوں آوازیں اُبھریں۔

"ان حالات میں یہ دعوت دینے کی ضرورت ہی کیا تھی۔" لیاقت کنور نے منہ بنا کر کہا۔

"اگر یہ اطمینان ہو گیا کہ یہاں کوئی غلط آدمی نہیں داخل ہو سکا تو پھر تمام مہمانوں کو ان سے ملوایا جائے گا، فکر نہ کریں۔"

ان کی اس بات پر سب نے خوشی کا اظہار کیا۔

"اور یہ اطمینان کب اور کس طرح ہو گا۔" لیاقت کنور نے کہا۔

"بس۔ ہو جائے گا۔ یہ آپ ہم پر چھوڑ دیں۔ اب میں حاضرین کو ایک نئی دعوت دیتا ہوں۔ کیا کوئی مہمان بتا سکتا ہے کہ ہم میں پروفیسر چین غوف کون سے ہیں۔"

"جی۔ کیا مطلب؟"

"ہر ایک کو دعوت دی جاتی ہے۔ چہروں کا جائزہ لیں اور یہ بتانے کی کوشش کریں کہ پروفیسر چین غوف کون سے ہیں۔" انھوں نے پھر کہا۔

"ہا ہا ہا۔ دعوت سے پہلے دعوت۔ بھئی واہ۔ دعوت ہو تو ایسی۔" فاروق نے شوخ لہجے میں کہا۔

"کیا دعوت دعوت لگا رکھی ہے۔" انھوں نے عادل پرویز کی بھنّائی ہوئی آواز سُنی۔

"ایک منٹ۔ کوئی صاحب کسی سے کچھ نہ کہیں۔ میں نے ایک اعلان کیا ہے۔ ایک دعوت دی ہے۔ آپ لوگوں میں سے کوئی بتا سکتا ہے۔ کہ ہم میں سے پروفیسر چین غوف کون ہیں؟"

"اگر کسی نے بتا دیا تو۔ تو کیا ہوگا۔"

"صدرِ محترم نے ان کے لیے ایک اعزاز مقرر کیا ہے، وُہ اس اعزاز کے حق دار ہوں گے۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"یہ دعوت کچھ مناسب نہیں۔" ایک آواز اُبھری۔ انھوں نے دیکھا، یہ جملہ ایک لمبے قد والے نے کہا تھا۔

"وُہ کیوں جناب؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"وُہ اس طرح کہ اوّل تو سب لوگوں نے پروفیسر صاحب کو دیکھ نہیں رکھا۔ دُوسرے یہ کہ وُہ میک اَپ میں ہیں، میک اَپ میں کسی شخص کو اس وقت تک نہیں پہچانا جا سکتا۔ جب تک کہ اسے اصل شکل صورت میں نہ دیکھا ہوا ہو۔"

"اعتراض بالکل بجا ہے۔ اور میں اس کا انتظام کر کے آیا ہوں۔"

یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید نے اپنے پیچھے کھڑے ایک شخص کو اشارہ کیا۔ اس نے بغل میں ایک بڑا سا فریم دبا رکھا تھا۔ اس پر کاغذ لپٹا ہوا تھا۔ اب وُہ آگے بڑھا، فریم پر سے کاغذ اُتارا اور فریم کو آتش دان پر رکھ دیا۔ اس میں ایک آدمی کی بہت ہی واضح تصویر تھی۔

"یہ پروفیسر چین غوف کی تصویر ہے۔ اسے غور سے دیکھ لیں۔ اچھی طرح دیکھ لیں اور اس کے بعد مہمانوں میں سے یہ بتایا جائے گا کہ پروفیسر کون ہیں؟"

اب سب لوگ تصویر کو بغور دیکھنے لگے۔ جب بہت

دیر تک دیکھ چکے تو سب مہمان ایک دوسرے کو گھورنے لگے ۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ان سب پر گھورنے کا دورہ پڑ گیا ہو۔

ایسے میں لمبے قد کا ایک آدمی زور سے اچھلا۔ اس نے چیخ کر کہا:

"اعزاز میں نے جیت لیا۔"

خنجر کا وار

"اعزاز آپ نے جیت لیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے ناخوش گوار لہجے میں کہا۔

"ہاں! میں جان گیا ہوں ۔ مسٹر چین غوث کون سے ہیں۔"

"تو پھر بتا دیں ۔ تاکہ آپ واقعی اعزاز حاصل کر سکیں، پہلے تو یہ فرمائیے۔ آپ کا نام کیا ہے؟"

"مجھے دریا خان کہتے ہیں۔ بنک دولت کا چیئرمین ہوں، اور میرا بیان یہ ہے کہ یہ صاحب دراصل پروفیسر چین غوث ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے آگے بڑھ کر ایک شخص کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

انھوں نے دیکھا ۔ جس کے کندھے پر ہاتھ رکھا گیا تھا۔ وہ لیاقت کنور تھا۔

"آپ یہ کس طرح کر سکتے ہیں؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"آپ کو اس سے کیا۔ میں کسی طرح بھی کر سکوں —
آپ کو پیڑ گننے سے غرض ہے۔ یا آم کھانے سے۔"

"ہوں! بات ٹھیک ہے۔ خیر جناب ہم اس بات کو تسلیم کر لیتے ہیں کہ آپ نے پروفیسر چین غوف کو تلاش کر لیا ہے۔ اب صدر صاحب سے اپنا اعزاز حاصل کر لیں۔"

تالیوں کی گونج میں دریا خان صدر صاحب کی طرف بڑھا، انھوں نے اس کے گلے میں ایک سنہری ہار پہنا دیا۔ دریا خان حد درجے خوش ہوا۔ اس نے فخریہ انداز میں سب کی طرف دیکھا۔

"مسٹر دریا خان۔ آپ کو انعام مبارک۔ اور اب ہم تقریب شروع کرتے ہیں۔ حاضرین۔ تفصیلات تو آپ اخبارات میں پڑھ چکے ہیں۔ اب پروفیسر صاحب کو دیکھ بھی لیا، لیکن ابھی اصلی شکل میں نہیں۔ یہ اپنی مرضی سے ہمارے ملک میں آئے ہیں اور اپنی خوشی سے اسلام قبول کیا ہے، پھر نہ جانے کیوں۔ وتناس کو شکایت ہے۔ اب اس کی کوشش یہ ہے کہ کسی طرح پروفیسر صاحب کو ہلاک کروا دے، لیکن ہمارے ہوتے، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ پروفیسر صاحب کی جگہ ہم ہلاک ہو سکتے ہیں، ان کا بال تک بیکا نہیں ہونے دیں گے۔ آپ لوگوں کا

کیا خیال ہے۔ کیا آپ تائید کرتے ہیں؟" انسپکٹر جمشید نے تقریر کرنے کے انداز میں کہا۔

"بالکل ٹھیک۔ بالکل ٹھیک۔" سب چلائے۔

"ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی انسپکٹر صاحب۔" کسی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

انھوں نے چونک کر آواز کی سمت میں دیکھا۔ جملہ کہنے والا عادل پرویز تھا۔

"جی فرمائیے۔ آپ کی سمجھ میں کیا بات نہیں آئی"

"پروفیسر صاحب کو خطرے سے بچانے کے لیے یہاں انھیں میک اپ میں لانے کا پروگرام بنایا گیا، پھر خود ہی لوگوں کو یہ دعوت دی گئی کہ وہ یہ بتائیں کہ مہمانوں میں پروفیسر صاحب کون سے ہیں۔ اور پہلی ہی کوشش میں ایک صاحب نے یہ بات بتا دی۔ تو آخر انھیں میک اپ میں لانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"آپ کا اعتراض وزنی ہے۔ آپ کی بات کا جواب میں ضرور دوں گا، لیکن کچھ دیر بعد۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کچھ دیر بعد کیوں اور اب کیوں نہیں؟" عادل پرویز نے کہا۔

"اس میں کچھ بہتری ہے۔" وہ مسکرائے۔

"خیر۔ یُوں ہی سہی"۔ عادل نے کندھے اچکائے۔

اس کے بعد تقریب شروع ہوئی۔ سب سے پہلے کھانے کا دور چلا۔ ہر شخص اپنی اپنی پسند کی چیزیں پلیٹ میں ڈال کر اِدھر اُدھر ہونے لگا۔ ہال بہت بڑا تھا۔ لوگ آسانی سے الگ الگ کھڑے ہو سکتے تھے، اچانک لیاقت کنور کی آواز اُبھری:

"میں۔ یہ کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

سب لوگ چونک اُٹھے۔ حیرت بھری نظروں سے لیاقت کنور کی طرف دیکھا، پھر انسپکٹر جمشید تیزی سے ان کی طرف بڑھے:

"کیا ہوا جناب؟"

"میں یہ کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

"کیوں۔ کیا بات ہے؟"

"جیسا کہ آپ کو معلوم ہے۔ بلکہ اب تو سب کو معلوم ہو چکا ہے کہ میں پروفیسر چین غوف ہوں۔ تو کیا یہ ممکن نہیں کہ میرے دشمن بھی اس دعوت میں شریک ہو گئے ہوں اور انھوں نے اس میں زہر ملا دیا ہو۔"

"لیکن کھانا تو آپ نے میز سے لیا ہے۔ آپ کے لیے الگ کھانا تو تیار نہیں کیا گیا۔"

"پاس سے گزرتا ہوا کوئی شخص تو ایسا کر سکتا ہے نا۔" لیاقت کنور نے کہا۔

"اوہ ہاں! اس کا واقعی امکان ہے۔ خیر۔ آپ یہ کھانا نہ کھائیں۔ بلکہ ہم ابھی اور اسی وقت اس کھانے کو چیک کر لیتے ہیں۔"

ایوانِ صدر میں پرندے پالے گئے تھے۔ کھانا ان میں سے چند کے آگے ڈالا گیا۔ وُہ کھانا کھانے لگے۔ ایک منٹ بعد ہی وُہ گرے اور مر گئے۔

ان سب کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں:

"آپ کا اندازہ بالکل درست نکلا پروفیسر صاحب۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"تب میں یہاں خطرے میں ہوں۔ دشمن یہاں موجود ہے۔ اور یہ آپ کی غلطی سے ہوا۔ آپ نے مجھے پہچاننے کی دعوت دی ہی کیوں تھی؟"

"اب تو ہو گئی غلطی۔ خیر۔ ہم آپ کو یہاں سے ایک بالکل محفوظ مقام پر پہنچا دیتے ہیں۔ اکرام ۔۔۔ تم یہاں موجود ہو یا نہیں؟" انھوں نے بلند آواز میں کہا اور چاروں طرف دیکھا۔

"جی ہاں! موجود ہوں۔" اکرام لوگوں کے درمیان سے

نکل کر ان کی طرف آ گیا۔

" انھیں بحفاظت وائٹ ہاؤس پہنچا دو۔ یہاں سے فارغ ہو کر میں وہیں پہنچوں گا۔"

" پپ - پتا نہیں - کیا چکر چل رہا ہے۔" کسی نے اُلجھن کے عالم میں کہا۔

" مہمانوں کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وُہ لطف اندوز ہوتے رہیں۔" صدر صاحب بولے۔

" او کے سر- آپ فکر نہ کریں- ان پر آنچ نہیں آنے دی جائے گی۔" اکرام نے فوراً کہا اور لیاقت کنور کی طرف بڑھا-

" نہیں! یہ نہیں ہو سکتا۔" لیاقت کنور نے چند قدم پیچھے ہٹ کر کہا۔

" کیوں جناب- ہو کیوں نہیں سکتا۔"

" یہ دعوت میرے اعزاز میں دی گئی ہے اور میں ہی یہاں نہ رہوں۔"

" لیکن آپ کی زندگی کو خطرہ ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

" تب پھر- آپ میرا دھیان رکھیں - اس کا صرف یہی طریقہ نہیں کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔"

" یہ بہت محفوظ طریقہ تھا۔"

" پتا نہیں - کیا چکر ہے - یہاں کیا ہو رہا ہے۔" کسی طرف سے آواز اُبھری ، لیکن انھوں نے توجہ نہیں دی۔

" کچھ بھی ہو- میں نہیں جاؤں گا۔"

" اچھا جیسے آپ کی مرضی - اب میں آپ کے ساتھ ساتھ رہوں گا- اور دُشمنوں کی سازش کو ناکام بنا کر رہوں گا۔" انھوں نے کہا۔

" یہ ہوئی نا بات"۔ لیاقت کنور نے خوش ہو کر کہا۔

" ایسا معلوم ہوتا ہے - جیسے آپ کوئی ڈراما کر رہے ہوں۔" عادل پرویز بول اُٹھا۔

" آپ بے شک یہ کہ سکتے ہیں - اس لیے کہ آپ یہی محسوس کر رہے ہیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

" آپ نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا - مہمانِ خصوصی کو میک اپ میں لا کر دُوسروں کو پہچاننے کی دعوت کیوں دی گئی؟"

" میں کہ چکا ہوں - اس کی ایک وجہ ہے - جو میں بعد میں بتاؤں گا۔" انھوں نے کہا۔

" پتا نہیں - کب بتائیں گے۔"

اچانک محمود پوری قوت کے ساتھ لیاقت کنور سے ٹکرا گیا - وُہ دھڑام سے گرے - ساتھ ہی ایک سنسناہٹ گونجی،

کھچ کی آواز سنائی دی۔

ان سب نے دیکھا۔ ایک لمبے پھل والا خنجر ایک دروازے میں پیوست ہو چکا تھا۔ ہال میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی،

"بہت خوب محمود۔ تم نے کمال کر دیا۔ ویسے اگر تم مہمانِ خصوصی کو نہ گراتے۔ تو بھی ان کا کچھ نہ بگڑتا۔ ان کے پورے جسم پر اس وقت بلٹ پروف لباس موجود ہے، یہاں تک کہ آنکھوں پر بھی۔"

"اوہ!" ان کے منہ سے نکلا۔

"بہر حال تم بہت اچھے رہے۔ اگر یہ بلٹ پروف لباس میں نہ ہوتے تو تمھارا یہ کارنامہ حد درجے شان دار تسلیم کیا جاتا۔ اب بھی ہم اسے کارنامہ ہی کہیں گے۔"

"شکریہ ابا جان ۔ مجھے اپنے کارناموں کے اظہار کی کوئی ضرورت نہیں ۔ پہلے تو یہ دیکھنا چاہیے کہ خنجر کس نے پھینکا تھا۔ بس اصل مجرم وہی ہے۔" محمود جلدی جلدی بولا۔

"ہاں! ٹھیک ہے ۔ تم نے کیسے جان لیا تھا کہ خنجر پھینکا جا رہا ہے؟"

"میں نے خنجر کی چمک لہراتے دیکھی تھی۔ بس میں ان سے ٹکرا گیا۔" اس نے کہا۔

"اور چمک کس جگہ لہرائی تھی؟" انھوں نے پوچھا۔

"سامنے گیلری میں۔"

ان سب کی نظریں گیلری کی طرف اُٹھ گئیں۔ مہمان تو سب ہال میں تھے۔ گیلری میں تو کوئی بھی نہیں تھا۔

"اس کا مطلب ہے ۔ پروفیسر کے دشمن نے اس جگہ مورچہ بنا رکھا تھا۔ وہ نظر بچا کر مہمانوں سے الگ ہو گیا ہو گا۔

اکرام۔ گیلری کو چیک کرو۔"

"او کے سر۔" اس نے کہا اور تیزی سے گیلری کی طرف بڑھا۔ جلد ہی اس کی آواز سنائی دی:

"یہاں اب کوئی نہیں ہے سر۔ لیکن تھوڑی دیر پہلے ضرور تھا۔ یہاں خنجر کا خول پڑا ہے۔"

"اس کو ہاتھ نہ لگانا اکرام۔ قاتل کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ہاتھوں پر دستانے پہن لیتا اور پھر لوگوں کے درمیان آنے سے پہلے اُتار بھی دیتا۔ لہٰذا اس پر اُنگلیوں کے نشانات ضرور ہوں گے۔"

"بہت بہتر سر۔"

"لیکن ابا جان ۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس نے رومال وغیرہ کے ذریعے خنجر یا اس کے خول کو پکڑا ہو۔" فرزانہ نے کہا۔

"ہاں! لیکن ہمیں کوشش تو کرنی چاہیے۔" وہ بولے اور

فرزانہ سر ہلا کر رہ گئی۔

"یہ بات بھی عجیب ہے کہ خنجر اندر کیسے آ گیا۔ ہر آدمی کی تلاشی لی گئی تھی۔"

"شاید خنجر کسی۔" انسپکٹر جمشید کے الفاظ درمیان میں رہ گئے۔ ان کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔ اور پھر وہ چہک کر بولے:

"میں نے جان لیا۔ خنجر اندر کس طرح آیا ہے۔ اور مُجرم بھی اب میرے سامنے ہے۔ نہیں مسٹر۔ تم فرار ہونے کی کوشش نہیں کرو گے۔ ویسے بھی باہر پہرہ موجود ہے۔ میری اجازت کے بغیر تو کسی کو بھی جانے نہیں دیا جائے گا۔" یہ الفاظ انھوں نے لمبے قد کے ایک شخص کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ نے یہ الفاظ مجھ سے کہے۔" لمبا آدمی حیران ہو کر بولا۔

"ہاں بالکل!"

"آپ کو ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔ اور بھلا میں بھاگنے کی کوشش کیوں کرنے لگا۔" اس نے کہا۔

"آپ کا نام؟" انسپکٹر جمشید اس کی طرف بڑھنے لگے۔

"میں ریاست مرزا ہوں۔"

"آپ کا عہدہ؟"

"نیشنل شپنگ کارپوریشن کا چیئرمین ہوں۔"

"بہت خوب۔ میں آپ کو چیک کرنا چاہتا ہوں۔" انھوں نے کہا۔

"لیکن کیوں۔ میں ایک اعلیٰ عہدے دار ہوں۔ یہاں بڑے بڑے آفیسر مجھ سے ذاتی طور پر واقف ہیں۔ خود صدرِ مملکت مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔" اس نے تلملا کر کہا۔

"ہاں جمشید۔ یہ ٹھیک ہے۔ تمھیں غلط فہمی ہوئی ہو گی۔" صدر صاحب نے منہ بنا کر کہا۔

"نہیں سر۔ مجھے غلط فہمی نہیں ہوئی۔ اور اگر ہوئی بھی ہے تو میں ان سے معافی مانگ لوں گا۔"

"بھرے مجمعے میں میری بے عزتی کرنے کے بعد آپ معافی مانگ لیں گے۔ بہت خوب۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"پھر۔ آپ ہی بتائیں۔ کیا کیا جائے۔ میرا خیال ہے۔ مسٹر لیاقت کنور پر خنجر سے وار آپ نے کیا تھا۔ آپ یہ کہتے ہیں کہ آپ پر شک کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اس کا فیصلہ تو صرف اسی طرح ممکن ہے کہ آپ مجھے اپنی تلاشی لینے کی اجازت دے دیں۔"

"کیوں سر۔ آپ کیا کہتے ہیں۔" ریاست مرزا نے فوراً کہا۔

"مجھے آپ پر ایک فی صد بھی شک نہیں ہے اور میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔" صدر صاحب مسکرائے۔

"شکریہ سر۔ آپ نے میری عزت رکھ لی۔" ریاست مرزا نے کہا۔

"لیکن سر۔ اس طرح میری عزت خاک میں مل کر رہ جائے گی۔ اگر میں آج ان کی تلاشی نہ لے سکا۔ اور یہ ثابت نہ کر سکا کہ حملہ انھوں نے ہی کیا تھا۔" انسپکٹر جمشید جذباتی لہجے میں بولے۔

"جمشید۔ تم بھی مجھے بہت عزیز ہو۔ کیوں نہ تم دونوں الگ کمرے میں بیٹھ کر بات کر لو۔ اور اپنا اطمینان کر لو۔" صدر صاحب بولے۔

"الگ کمرے میں۔ جی بہتر۔ آپ کی مرضی۔ آیئے۔ مسٹر ریاست مرزا ہم الگ کمرے میں بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"ضرور ضرور کیوں نہیں۔" ریاست مرزا نے مسکرا کر کہا۔

انسپکٹر جمشید اس کے نزدیک ہو گئے اور پھر اچانک انھوں نے اس کے ہاتھ کی چھڑی جھپٹ لی۔ اور جھپٹتے ہی چھڑی کے دستے کو فرش پر دے مارا۔

رنگین شیشے کا دستہ فوراً ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا۔

"یہ۔ یہ آپ نے کیا کیا۔ میری انتہائی قیمتی چھڑی توڑ دی۔" ریاست مرزا چلایا۔

"جمشید۔ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔" صدر صاحب نے کہا۔

"مم۔ میں۔ میں کیا کروں سر۔ یہ دیکھیے چھڑی کے دستے کے نیچے خنجر رکھنے کی جگہ۔" انسپکٹر جمشید نے چھڑی ان کی طرف کر دی۔

"کیا!" کئی آوازیں اُبھریں۔

لوگوں کے منہ کھلے کے کھلے اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"اکرام۔ وہ خول مجھے دو۔"

اکرام سے خول لے کر انھوں نے سب کے سامنے اس خلا میں ڈال دیا۔ خنجر کا خول اس میں بالکل فٹ آ گیا۔

"اب تو کسی کو کوئی شک نہیں رہا۔" انسپکٹر جمشید فاتحانہ انداز میں بولے۔

اب سب کی نظریں ریاست مرزا کی طرف گھوم گئیں، اس کا حال تو وہ تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

"یہ۔ یہ کیا ریاست مرزا؟"

" یہ۔ یہ چھڑی میری نہیں ہے سر۔" ریاست مرزا نے
ہکلا کر کہا۔
"بہت خوب۔ تو پھر کس کی ہے؟"
" ایک دوست کی۔ اس سے لے کر آیا تھا۔"
" لیکن ابھی ابھی تو آپ نے کہا تھا کہ میری انتہائی قیمتی
چھڑی توڑ دی۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔
" وہ۔ وہ تو میں روانی میں کہ گیا تھا۔"
" خیر۔ اگر یہ چھڑی کسی دوست کی ہے تو کیا وہ دوست
بھی یہاں موجود ہیں؟"
" نن۔ نہیں۔"
" تب پھر چھڑی میں رکھا ہوا خنجر آپ نے ہی استعمال
کیا ہے۔ چھڑی کسی کی بھی ہو۔ ہمیں اس سے غرض نہیں۔"
انسپکٹر جمشید بولے۔
" مم۔ میں۔ میں۔" اس سے کوئی بات بن نہ پڑی۔
" مجرم حاضر ہے سر۔ وشاس کے جاسوسوں کا اس ملک
میں باس۔ سب جاسوس اس کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔"
" یہ۔ یہ میں کیا سن رہا ہوں۔"
" پروفیسر چین غوف کو ہلاک کرنے کے لیے اپنے کارندے
بھی اسی نے بھیجے تھے۔ پھر اسے خود بھی وہاں جانا پڑا

کیوں کہ ہم وہاں پہنچ گئے تھے۔"
" لیکن آپ کو اس پر شک کس طرح ہوا؟" ایک مہمان نے
حیران ہو کر کہا۔
" اس چھڑی کو دیکھ کر۔ جوں ہی خنجر کے خول کا ذکر
آیا۔ اس نے گھبرا کر چھڑی کی طرف دیکھا تھا اور پھر
اس کے دستے پر اس طرح ہاتھ رکھ دیا کہ دستہ نظر
نہ آسکے۔ چور کی داڑھی میں تنکا۔ اگر یہ ایسا نہ کرتا تو
مجھے خیال بھی نہ گزرتا۔ اب یہ بھی سن لیں کہ میں یہاں
کیا پروگرام بنا کر آیا تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ جن کے اعزاز
میں یہ دعوت دی گئی ہے۔ یعنی پروفیسر چین غوف۔ ان کو
تو یہاں لایا ہی نہیں گیا۔"
" جی۔ کیا مطلب؟" کئی آوازیں ابھریں۔
" ہاں! انھیں وائٹ ہاؤس میں رکھا گیا ہے۔ جہاں وہ
اللہ کی مہربانی سے پوری طرح محفوظ ہیں۔"
" اور۔ اور یہ لیاقت کنور؟"
" یہ ہمارے محکمے کے ایک بہت ہوشیار کارکن ہیں۔
انھیں لیاقت کنور کے میک اپ میں لایا گیا۔ لیاقت کنور
آج گھر میں آرام کر رہے ہیں، پھر یہاں پروفیسر چین غوف
کو پہچاننے کا اعلان کیا گیا۔ مسٹر دریا خان نے لیاقت کنور

کے میک اپ میں ہمارے کارکُن کو پروفیسر چین غوف قرار دیا اور ہم نے یہ بات فوراً مان لی۔ دراصل دریا خان بھی ہمارے محکمے کے ہی آدمی ہیں اور اصل دریا خان بھی آج آرام کر رہے ہیں۔ میں یہ چاہتا تھا کہ مجرم کو یہ یقین ہو جائے کہ پروفیسر چین غوف کو لیاقت کنور کے رُوپ میں لایا گیا ہے اور وُہ اس پر حملہ کرے۔ ان کی حفاظت کا انتظام کر لیا گیا تھا۔ انھیں یہاں کوئی چیز کھانی نہیں تھی۔ گولی اور خنجر کے وار سے یہ ویسے ہی محفوظ رہتے۔ گویا، ہم نے یہ جال بچھایا تھا چالاک مجرم کے لیے اور اللہ کی مہربانی سے ہم اس جال میں کامیاب رہے۔ آپ لوگوں کا کیا خیال ہے؟"

"حیرت ہوئی۔ یہ ساری بات سُن کر۔ آپ بہت کمال کے آدمی ہیں۔" ایک آفیسر نے کہا۔

"اور مجھے بہت دُکھ ہوا۔ ہم نے آستینوں میں کیسے کیسے سانپ پالے ہوئے ہیں۔"

"کک۔ کک۔ کک۔" فارُوق ہکلا کر رہ گیا۔

"کیوں۔ تمھیں کیا ہوا۔" فرزانہ نے اسے گھورا۔

"کک۔ کیسے کیسے سانپ۔" اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"ہاں! ٹھیک تو ہے، پھر کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"مم۔ میں۔ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ۔ یہ تو۔"

"اوہ، ہم سمجھ گئے۔" محمود اور فرزانہ نے ہنس کر کہا، پھر دونوں نے فارُوق کو بیک وقت دھول ماری۔ فارُوق یک دم بیٹھ گیا اور ان کی دھولیں آپس میں ٹکرا گئیں۔

ختم شد

فائدے کی باتیں

☆ آئندہ ماہ انشاء اللہ آپ پھر ایک خاص نمبر پڑھیں گے....

خزانے کی روح (قیمت 60 روپے)

مندرجہ ذیل پرانے ناول بھی آپ ساتھ پڑھ سکیں گے....

☆ "بیگال مشن II" (قیمت 36 روپے) "گینڈا گروہ" منی خاص نمبر (قیمت 30 روپے) "بھڈالی کا میدان" منی خاص نمبر (قیمت 30 روپے) "لنگڑا انتقام" منی خاص نمبر (قیمت 30 روپے) "غار کا کنواں" منی خاص نمبر (قیمت 30 روپے)

☆ پہلی بات تو یہ ہے کہ آئندہ آپ ہر ماہ پرانے ناولوں میں "منی خاص نمبر" پڑھ سکیں گے.... یہ ناول بھی بہت مدت سے ختم تھے آپ کی فرمائش پر انہیں دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے.... امید ہے منی خاص نمبروں کا یہ سلسلہ آپ کو پسند آئے گا

☆ اور اب آتے ہیں "فائدے کی باتیں" کی طرف۔

☆ ان تمام ناولوں کی کل قیمت 216 روپے ہے.... لیکن براہ راست ادارے سے منگوانے پر آپ کو یہ تمام ناول رعایتی قیمت 185 روپے میں ملیں گے.... ناول بذریعہ وی پی ارسال کیے جاتے ہیں۔

☆ پوسٹ مین آپ سے رعایتی قیمت سے 5 روپے زیادہ وصول کرے گا۔ اس طرح آپ کو یہ تمام ناول 190 روپے میں گھر بیٹھے ملنے کے ساتھ ساتھ 26 روپے کی بچت ہوگی۔

☆ وقت کی بچت.... روپے کی بچت.... یعنی ایک ٹکٹ میں دو مزے۔

☆ خط لکھ کر فوراً اپنا آرڈر نوٹ کروائیں۔

انداز پبلی کیشنز 9/12 نصیر آباد، سانده کلاں۔ لاہور

ان کی کہانیوں کے کردار شرارتیں کرنے پہ آئیں تو گماں گزرتا ہے
کہ لکھنے والا انہی شرارتوں سے بھی بنا ہے جو ہر ادا نرالی اور ہر انداز
مسکراہٹ لیے ہے۔ سائنس کی باتیں کرنے لگیں تو یقین کرنا مشکل ہو جاتا
ہے کہ کسی خفیہ اور پوشیدہ' سائنسی نسخوں کے خزانے تک رسائی رکھے بغیر
بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ مگر سچی بات تو یہ ہے کہ اشتیاق احمد کے ذہن کی
رسائی ہر اس خوبصورت اور نازک مقام تک ہے جہاں بہت سوں کے پر
جلنے لگتے ہیں۔ وہ خوش بخت ہیں کہ انھیں بے شمار پڑھنے والے ہی نہیں'
ان کی طرح سوچنے اور انھیں سمجھنے اور پیار کرنے والے مل گئے ہیں....
جنھیں اپنی آنکھوں اور ان کے لکھے لفظوں کا عکس ایک سا لگتا ہے۔ یہی
وہ مقام ہوتا ہے جہاں پڑھنے والا لفظوں سے تعریف اور دعا نہیں کرتا بلکہ
اس کا چہرہ بتاتا ہے کہ رواں رواں مصروف دعا ہے۔
اختر عباس
ANDAZ
PUBLICATIONS